اقبالؔ

ایک مردِ آفاقی

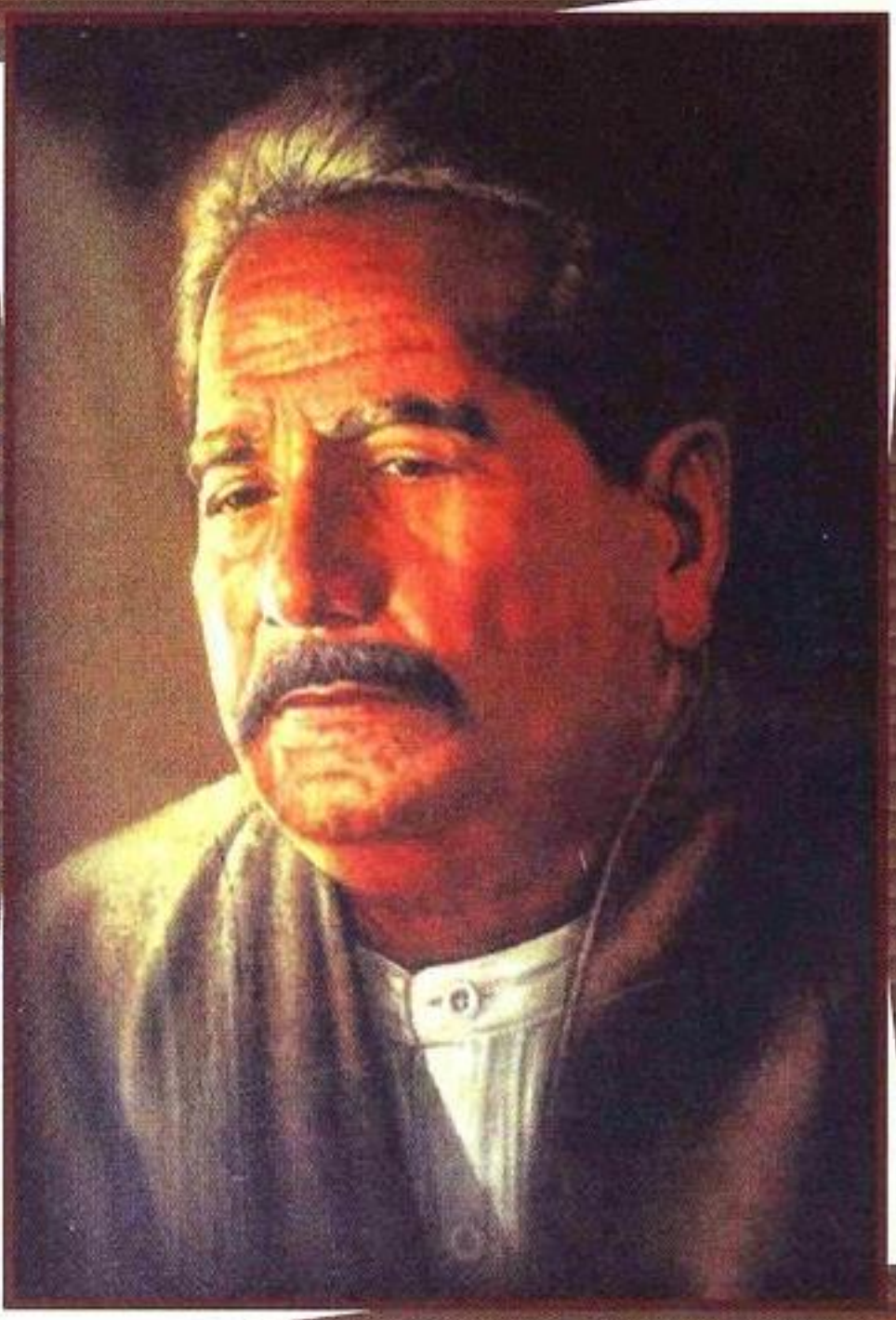

مصنف

پروفیسر راج موہن گاندھی

مترجم

پروفیسر یوسف کمال

ناشر: اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد

علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور افکار کا ایک بصیرت افروز مطالعہ

اقبالؔ ۔ ایک مردِ آفاقی

(انگریزی سے ترجمہ)

مصنف

راج موہن گاندھی

مترجم

یوسف کمال

ناشر: اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد

ISBN: 81-86370-45-5

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	اقبالؔ۔ایک مرد آفاقی
مصنف	:	راج موہن گاندھی
مترجم	:	یوسف کمال
سن اشاعت	:	2009ء
ناشر	:	اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد
ڈاٹا پروسیس	:	نورڈی ٹی پی سنٹر، چنچل گوڑہ۔
صفحات	:	64
قیمت	:	Rs-80/-
طباعت	:	شارپ کمپیوٹرس، ملک پیٹ، 9392427796

کتاب ملنے کے پتے

- اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل، بنجارہ ہلز حیدرآباد، 500002
- اردو بک ڈپو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد 500029
- ہدی بک ڈپو، پرانی حویلی، حیدرآباد 500002
- انجمن ترقی اردو، راؤز ایونیو، نئی دہلی

☆☆☆☆☆

انتساب

جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم

بانی اقبال اکیڈیمی کی یادوں کی نذر

فہرست

نشان سلسلہ	عنوان	صفحہ نمبر
1	انتساب	۳
2	ناشر کے قلم سے	۷
3	عرض مترجم	۹
4	اقبالؔ۔ایک مرد آفاقی	۱۱
5	کتابیات	۶۳

سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

(اقبالؔ)

ناشر کے قلم سے

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی نئی کتاب ''اقبال ۔ایک مرد آفاقی'' پیش خدمت ہے۔ ہندوستان کے معروف دانشور راج موہن گاندھی نے 1986ء میں ایک انگریزی کتاب "Understanding the Muslim Mind" لکھی تھی ۔اس کتاب کی علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی اوراس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ۔ 1857ء کے بعد کے برصغیر کی آٹھ مسلم عبقری شخصیتوں کی سوانح پر مشتمل اس کتاب میں پروفیسر راج موہن گاندھی نے اپنے دادا گاندھی جی اور نانا راجگو پال چاری کے ہم عصر مفکّر وشاعر علامہ اقبالؔ کو بھی اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں کیلئے خصوصاً اور سارے برصغیر کیلئے عموماً ایک گنج بے بہا تھے۔

اقبالؔ پر سینکڑوں کتابیں اور مقالات لکھے جاچکے ہیں ۔راج موہن گاندھی نے بھی قلم اٹھایا ہے۔آزادی کے بعد کے تناظر میں ان کے پیش کردہ خیالات متوازن اور معتدل حیثیت کے حامل ہیں ۔ان کی دیانتِ فکر سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔اقبالؔ جیسے عظیم شاعر اور مفکر کی حیثیت جب مسلّم ہوجاتی ہے تو اپنے انفرادی نقطۂ نظر سے ان کی تاویل اور تشریح کی کوشش کی جاتی ہے اور بسا اوقات معروضیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔لیکن راج موہن گاندھی نے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔اس مختصر کتاب میں فکرِ اقبالؔ کے تمام پہلوؤں کا کماحقہ احاطہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تشنگی تو رہے گی لیکن توقع رکھتا ہوں کہ یہ کتاب قاری کو اقبالیات کے تفصیلی مطالعہ کیلئے آمادہ کرے گی۔ ویسے بھی اس دور میں مبسوط کتابوں کے مطالعہ کا رجحان

کم ہوتا جارہا ہے۔ایسے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب مطالعہ اقبالؔ کی ترغیب میں ممد ومعاون ثابت ہوگی۔

ترجمہ نگاری کوئی آسان فن نہیں ہے۔مترجم کا وسیع مطالعہ اور قادرالکلامی ترجمہ نگاری کے فن کیلئے بہت ضروری ہے۔ڈاکٹر یوسف کمال ترجمہ کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔یہ ترجمہ سلاست، سادگی اور سبک رفتاری کا آئینہ دار ہے۔بنیادی طور پر ڈاکٹر کمال ماہر ارضیات ہیں۔لیکن اردو ادب اور اقبالیات سے ان کا گہرا ربط رہا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا میں صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اقبالؔ اکیڈیمی کی یہ پیشکش اقبالؔ فہمی میں مدد دے گی اور ڈاکٹر کمال کی یہ محنت اقبالیات میں اپنا مقام پائے گی۔

نائب صدر
محمد ضیاءالدین نیر

عرض مترجم

ہندوستانی مسلمانوں نے 20 ویں صدی میں قومی، بین الاقوامی اور ملی سطحوں پر کیا کچھ سوچا اور کیا کچھ کیا۔ یہ ایک بہت وسیع، عمیق اور پیچیدہ موضوع ہے جس پر دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں اور ابھی یہ کام جاری ہے۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لئے بابائے قوم مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی نے جو بہ ذات خود بڑے محقق، ادیب اور صحافی ہیں، بڑی جانفشانی کے ساتھ 1986ء میں دو تین سال کی عرق ریزی کے بعد برصغیر کے 8 رہنماؤں، مفکروں اور دانشوروں کے حوالے سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا عنوان ہے Understanding the Muslim Mind یعنی مسلم ذہن کا مطالعہ۔ اس کتاب میں انیسویں صدی کی نمائندگی صرف سرسید احمد خان سے ہوتی ہے جب کہ علامہ اقبال سے ڈاکٹر ذاکر حسین تک باقی سات رہ نماؤں کا تعلق 20 ویں صدی سے ہے۔ 1986 سے 2000 عیسوی تک اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب میں علامہ اقبالؔ پر لکھا گیا مضمون، شاعر مشرق کی شخصیت کی نشو ونما اور ان کے ہمہ گیر فکر و فلسفہ پر ایک مبسوط مقالہ سے کم نہیں۔ اگرچیکہ اقبالؔ کی شخصیت، شاعری اور فکر پر اردو اور انگریزی میں کئی سو مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ مگر راج موہن گاندھی کے اس مضمون کے اردو ترجمے کا جواز یہ ہے کہ اردو اور فارسی سے ناواقف ہونے کے باوجود، انہوں نے انگریزی حوالوں اور مواد کی مدد سے اقبال کی شخصیت اور فکر کے مختلف پہلوؤں پر ایک نہایت متوازن، معروضی اور بصیرت افروز مقالہ لکھا ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ راج موہن گاندھی نے علامہ اقبالؔ کی ذات، فکر اور ان کے عہد کے سمندر کو ایک کوزے

میں سمیٹنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ راج موہن گاندھی کی یہ تحریر ایجابی ہونے کے باوجود تنقیدی بصیرت سے عاری نہیں۔

راج موہن گاندھی کی انگریزی نثر ادبی چاشنی، تخیل آفرینی اور خلاقیت سے بھرپور ہوتی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان محاسن کو ترجمے میں برقرار رکھ سکوں۔ مصنف نے اقبالؔ کے اشعار کے انگریزی ترجموں کو جا بجا استعمال کیا ہے۔ میں نے ان ترجموں سے اقبالؔ کی شاعری کے اصل اردو اور فارسی متن کو تلاش کیا ہے۔ اقبالؔ کے فارسی اشعار کا بھی اردو ترجمہ میرے دوست مضطر مجاز کے اقبال کے تراجم سے مستعار لیا ہے تاکہ پورے کا پورا ترجمہ اردو زبان میں ہی ہو۔

راج موہن گاندھی کا یہ طویل مضمون ایک غیر مسلم اور غیر اردو داں اسکالر کی ایسی تحسین ہے جس سے اقبالؔ اور ہندوستان کے بارے میں پیدا کی گئی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی۔

میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شکر گذار ہوں کہ اس نے اس ترجمے کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

(ی۔ک)

☆☆☆

اقبالؔ۔

ایک مردِ آفاقی

رات بنائی تو نے اگر تو میں نے چراغ بنایا
تو نے بنائی مٹی اگر تو میں نے ایاغ بنایا
تو نے بنائے اگر بیابان و کہسار و راغ
کیے آراستہ میں نے خیابان و گلزار و باغ
میں وہ ہوں جو پتھر سے بھی اک آئینہ بنالوں
ہاتھ آجائے زہر تو اس کو میں نوشینہ بنالوں

(پیام مشرق سے ترجمہ مضطر مجاز)

جو حرم کے اندر آکر سوگیا
ایسے اک دیں دار سے سو مرتبہ
کافر بیدار دل اچھا ہے وہ
بت کے آگے جاگتا رہتا ہے جو

(جاوید نامہ سے۔ترجمہ م۔م)

تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانہ ٔ دل

(نظم ''دل'' سے)

کیا یہ کوئی تعجب خیز امر ہے کہ فارسی اور اردو زبان میں کہے گئے ان طبع زاد اشعار کا خالق ایک زبردست شاعر۔ مفکر تھا؟ پروفیسر محمد مجیب جیسے محتاط مبصر نے بھی یہ کہہ کر داد دی کہ اقبالؔ کی شاعری میں زبردست کشش تھی۔ پاکستان کے ایک اسکالر فضل الرحمٰن، اقبالؔ کو شاعر ہونے کے علاوہ عالم اسلام کے سب سے جرأت مند ماڈرن دانش ور قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر کانٹ ویل اسمتھ نے 1946 کی ایک تحریر میں اقبال کے نظریہ احترام آدمیت اور انسان کے خدا کے رفیق کار ہونے کے بارے میں لکھا کہ یہ نقاط ہائے نظر دینی فکر میں انقلاب سے کم نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ماڈرن اسلام کے لئے یہ نہایت اہم اور ضروری تبدیلی تھی۔ کیونکہ اس طرح خدا سے روایتی دوری کی غلطی کی تلافی ہوگئی اور پھر خدا دنیا میں انسان کے روبرو، اس کے ساتھ ساتھ اور اس کے اندر یوں کارفرما ہوگیا کہ ہر لمحہ ایک نئی اور بہتر دنیا انسان کے ہاتھوں تخلیق ہوتی رہی۔

''محمد اقبال نے سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگایا'' اس بات کو اسمتھ کے علاوہ کئی مفکروں اور مصنفوں نے بھی دہرایا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اقبال کے پیام پر توجہ دی یا اس کو سمجھنے کا دعویٰ کیا انھوں نے شاعر کے بارے میں متضاد قسم کی باتیں کہیں کیونکہ اقبالؔ کے مداحوں میں مسلم سوشلسٹوں سے لے کر کٹر رجعت پسند بھی شامل ہیں۔

اسمتھ نے گیارہ سال بعد لکھے گئے ایک اور مضمون میں اقبالؔ کی مشہور زمانہ نظم ''شکوہ'' (1912ء) کو نہایت معنی خیز تخلیق قرار دیتے ہوئے بتلایا کہ اس نظم کا تاریخی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں آزاد خیالی کا رجحان کمزور پڑ گیا۔ پروفیسر مجیب نے بھی اپنے ناقدانہ جائزے میں بتایا کہ گو کہ مفکر اقبالؔ شخصیت کی آزاد نشوونما کی بات کرتے ہیں مگر عملی راہ نما کی حیثیت سے انھوں نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ شریعت کے قوانین کی کھلی معنویت سے آگے نہ جائیں کیونکہ خدا ایک ایسا جوہری ہے جس نے خود شریعت کے نگینے کو تراشا ہے چنانچہ کارہائے خیر کی نئی جہتوں کو کھوجنے کے بجائے اقبالؔ مسلم تاریخ اور فکر کی روایتی راہوں پر چل پڑے۔

اقبال پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سیالکوٹ میں 1876ء میں پیدا ہوئے جو لاہور اور جموں و کشمیر کے درمیان واقع ہے۔ وہ ایک کشمیری النسل برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کے آبا و اجداد نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ اقبالؔ کے دادا شیخ رفیق شالوں کے تاجر تھے۔ ان کے ایک فرزند نور محمد تھے۔ زیادہ تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ انھوں نے خیاطی اور کشیدہ کاری کا پیشہ اختیار کیا۔ سرخ رنگ، سفید ڈاڑھی اور چبھنے والی آنکھوں کے حلیے کے ساتھ نور محمد مزاجاً تصوف کی طرف مائل تھے۔ ان کا تعلق صوفیوں کے ایک سلسلے سے تھا۔ ان کے احباب ان کو ''اَن پڑھ صوفی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ فن خیاطی میں ان کی مہارت سے متاثر ہو کر ایک مقامی افسر نے ان کے لئے اس وقت کی نئی ایجاد، سنگر مشین خرید کر ان کو مستعار دی۔ ان کی زوجہ محترمہ ایمان بی بی حرام و حلال کے بارے میں بہت زیادہ سخت تھیں۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ مقامی افسر کی آمدنی مشکوک ہے تو انھوں نے سنگر مشین سے ہونے والی آمدنی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نور محمد نے مشین واپس کر دی اور ٹوپیوں پر کشیدہ کاری کا کام شروع کر دیا۔ یہ کام چل پڑا اور نور محمد نے بعد کے دنوں میں کئی اور کاریگروں کو بھی کام پر لگایا، اس طرح انھوں نے ایک بڑی ورکشاپ قائم کر لی۔

اقبال، نور محمد اور ایمان بی بی کی اولاد تھے۔ ان کی تین بہنیں تھیں اور ایک بھائی عطاء محمد تھے۔ جو اقبال سے سولہ سال بڑے تھے۔ عطا محمد کے خسر ایک وظیفہ یاب فوجی تھے جن کی وساطت سے داماد کو نوکری مل گئی تھی۔ وہ فوج کے میکانیکل محکمہ میں اوورسیر تھے۔ بڑے بھائی کی آمدنی کی وجہ سے اقبالؔ اسکول اور کالج کی تعلیم جاری رکھ سکے۔

اقبال کے گھریلو ماحول کا اندازہ، جس میں ان کی تربیت ہوئی ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر انھوں نے بعد میں اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ اس نظم کا تعلق ان کے بچپن کے ایک واقعے سے ہے جب عہد طفلی میں انھوں نے ایک فقیر کو مارا تھا جس کے ہاتھوں سے خیرات کے پیسے گر گئے تھے۔ اقبالؔ نے ''رموز بے خودی'' میں اپنے والد کی زبانی اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ۔

ایک ذرا عور کر اے بیٹے ! خیر البشرؐ کے اس اجتماع کو یاد کر

پھر میری اس سفید ڈاڑھی پر نظر کر اور میرے امید و خوف کو دیکھ
اپنے باپ پر نازیبا ظلم نہ کر خدا کے سامنے اس بندے کو رسوا نہ کر
تو تو شاخسار مصطفیٰ ؐ کا ایک غنچہ ہے مصطفیٰ ؐ کی بادبہاری کے طفیل ایک پھول بن جا

(آزادترجمہ)

اقبالؔ سولہ سال کی عمر میں سیالکوٹ کے اسکاٹش مشن کالج (جسے اب مرے کالج کہا جاتا ہے) میں داخل ہوئے۔ اسی سال ایک ڈاکٹر کی دختر نیک اختر کریم بی بی سے ان کی شادی ہوئی۔ ان کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی تو پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیاری ہوگئی جبکہ دوسری بیٹی کئی بیماریوں میں مبتلا ہوکر 19 سال کی عمر میں گزر گئی۔ ان کے بیٹے آفتاب آگے چل کر انٹرنیشنل کارپوریٹ وکیل بنے۔ 19 سال کی عمر میں اقبال نے گورنمنٹ کالج ' لاہور میں داخلہ لیا۔ یہاں انھوں نے عربی اور انگریزی ادبیات کے ساتھ فلسفے کی تعلیم' تھامس آرنلڈ کی نگرانی میں حاصل کی۔ تھامس آرنلڈ علی گڑھ کے ایم اے او کالج سے حال ہی میں لاہور کالج چلے آئے تھے۔ تھامس آرنلڈ' علی گڑھ کے قیام کے دوران اپنی انگریزی تصنیف ''پریچنگ آف اسلام'' مکمل کر چکے تھے جو غالباً کسی بھی مغربی دانش ور کی طرف سے اسلام پر لکھی جانے والی پہلی کتاب تھی جس میں انھوں نے اسلام کی پرامن تبلیغ کی بات کی تھی۔ (اگرچیکہ یہ حقیقت کا صرف ایک ہی پہلو نہیں تھا)

اس کے جواب میں علی گڑھ کے ہی آرنلڈ کے ایک ساتھی شبلی نعمانی نے ایم اے او کالج میں کہا تھا کہ ''یورپ نے صرف تلوار کے زور پر ہی دنیا کی اقوام پر فتح حاصل نہیں کی'' اور آرنلڈ کی مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ خود یوروپین کردار کی ایک قابل تعریف زندہ مثال ہیں ''۔ آرنلڈ کی حرارت نفس اور اسلامی تہذیب کی تفہیم نے اقبالؔ کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ آرنلڈ نے ہی اقبالؔ کو یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے اکسایا۔ 1904ء میں جب آرنلڈ لاہور سے یورپ گئے تو اقبالؔ نے ''نالۂ فراق'' کے عنوان سے ان کے اعزاز میں

ایک نظم لکھی۔

اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں سے ہندوستان 6 سال قبل ہی متعارف ہو چکا تھا۔ 22 سال کی عمر میں انھوں نے لاہور کے حکیماں بازار کے مشاعرے میں ایک شعر پر مشاعرہ لوٹ لیا تھا ۔وہ شعر تھا ۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

مشاعرے میں موجود استادِ سخن مرزا گورگانی نے بے ساختہ داد دی اور کہا ''اقبالؔ اس عمر میں ایسا خوبصورت شعر!''

23 سال کی عمر میں اقبالؔ نے عربی، تاریخ اور معاشیات پڑھانا شروع کیا اس وقت ان کی تنخواہ 73 روپے ماہانہ تھی۔ قانون اور سیول سرویس کے پیشے معاشی طور پر زیادہ پُرکشش تھے۔ قانون کے امتحان میں وہ ناکام رہے اور سیول سرویس کے لئے بھی ان کو طبی بنیاد پر ناموزوں قرار دیا گیا۔ اگرچیکہ ان ناکامیوں سے اقبالؔ کو صدمہ پہنچا مگر مستقبل میں عظمتیں ان کے مقدر کے لئے محفوظ کر دی گئی تھیں۔

دوسرا صدمہ اقبال کو اس وقت پہنچا جب فوجی محکمہ نے ان کے بڑے بھائی عطا محمد پر جو وہاں اب کسی بڑے عہدے پر فائز تھے، فرد جرم لگا کر ماخوذ کر دیا تھا مگر اقبالؔ کو یقین تھا کہ ان کے بھائی کو فرضی جرم میں پھانسا جا رہا ہے۔ انھوں نے حقائق کو جمع کیا اور اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن کے پاس ایک اپیل روانہ کی۔ لارڈ کرزن کی راست دلچسپی اور دخل اندازی سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ اس سلسلے میں اقبالؔ نے ایک نہایت متاثر کن نظم صوفی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے نام لکھ کر گزارش کی کہ وہ اللہ کی مدد سے ان کے بھائی کو دشمنوں کی سازشوں سے بچائیں۔ ''برگِ گل'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی یہ نظم حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر لٹکا دی گئی جسے ہر سال عرس کے موقع پر پڑھا جاتا تھا۔ دو سال بعد جبکہ اقبال کی عمر 29 سال تھی وہ یورپ کے لئے روانہ ہوئے۔ یورپ جاتے ہوئے

انھوں نے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی اور ان کی شان میں ایک نظم ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے پیش کی۔ اقبال کی زندگی میں ان واقعات کی اہمیت اس لئے ہے کہ بعد کے سالوں میں اقبال نے تصوف کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور احمدیت کو یکسر رد کر دیا جب کہ خود ان کے بھائی عطا محمد نے احمدیت کو اپنا لیا تھا۔

1905ء میں جب اقبال یورپ روانہ ہو رہے تھے اس وقت تک وہ ''نالۂ یتیم''، ''ابر گہربار''، ''تصویر درد''، ''پرندے کی فریاد''، ''ترانۂ ہندی'' اور ''نیا شوالہ'' جیسی معرکۃ الآراء نظموں کی وجہ سے ہندوستان گیر شہرت کے حامل ہو چکے تھے۔

''پرندے کی فریاد'' کا موضوع ہندوستان کی غلامی ہے جس میں قفس میں قید پرندہ علامتی طور پر آسمانوں میں پرواز کرنے کا آرزومند ہے۔ ''تصویر درد''، ''نیا شوالہ'' اور ''ترانۂ ہندی'' میں اقبال نے ہندو مسلم اتحاد کی اپیل کی تھی۔ ''ترانۂ ہندی'' آج بھی اس قدر مقبول ہے کہ غلط نہ ہوگا اگر اسے ہندوستان کا غیر سرکاری قومی ترانہ کہا جائے۔ ''نیا شوالہ'' میں اقبال نے کہا۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں میں اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے میت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

گو کہ یہ تیرتھ ہندوستان نہیں ہے لیکن وہ اس کی تعمیر ہندوستان میں کرنا چاہتے تھے۔ اس تیرتھ کو اقبالؔ اسلام اور ہندومت کو ایک دوسرے میں ضم کر کے نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ اسے سارے ہندوستانیوں کے باہمی میل جول سے محبت کی ایک قربان گاہ کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے ''ترانۂ ہندی'' کی جگہ ''ترانۂ ملی'' لکھا۔ اس طرح وہ ''شاعر ہند'' سے ''شاعر اسلام'' بن گئے۔ اس کے باوجود پروفیسر مجیب کے اس خیال سے اختلاف مشکل ہے کہ ''اقبال کی ہندوستانی عوام میں اتحاد و یگانگت کی خواہش ایک گزرتے زمانے کی سیاسی ضرورت سے کہیں زیادہ ان کے اندر موجود ایک ''روحانی اساس'' کی نشاندہی کرتی ہے۔''

یورپ میں تین سال کے قیام کے دوران اقبالؔ نے کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفے اور لندن کی لنکنس ان (Lincoln's Inn) میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ''ایران میں مابعد الطبیعات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قیام یورپ کے دوران اپنے قریبی دوست عبدالقادر سے انھوں نے کہا کہ ''میں نے شعر گوئی ترک کرنے کا ارادہ کرلیا ہے'' لیکن ان کے استاد آرنلڈ نے انھیں قائل کیا کہ بہرحال دل جمعی سے انھیں کچھ مفید کام کرنا چاہئے۔ قیام یورپ کے دوران ہی اقبالؔ، شاعری کے لئے اردو سے فارسی کی طرف مائل ہوئے۔ بعد میں انھوں نے لکھا کہ ؎

> اگرچہ ہندی (اردو) شیرینی میں شکر کی طرح ہے/لیکن فارسی کی طرز گفتار شیریں تر ہے/میری فکر اس کے جلوے سے مسحور ہو کر رہ گئی ہے /اور میرا قلم طور کی ایک شاخ بن کر رہ گیا ہے/فارسی زبان مرے بلند خیالات کے اظہار کے لئے موزوں اور مناسب ہے/اور اسی طرح میری فکر اور فطرت کے مطابق بھی ! (تمہید اسرار خودی سے آزاد ترجمہ)

اقبالؔ کو اور خود ان کے سامعین کو اندازہ تھا کہ اردو زبان ان کے بلند پرواز خیالات و افکار کا بوجھ آسانی کے ساتھ سہار سکتی ہے مگر جیسا کہ حفیظ ملک کا خیال ہے اقبال غالباً اپنے لئے وسیع تر سامعین کی تلاش میں اس زمانے کے عالم اسلام میں رائج فارسی زبان کی طرف مائل ہوئے۔

یورپ میں اقبالؔ عطیہ فیضی کے دام محبت میں گرفتار ہو گئے۔ عطیہ فیضی کا تعلق بمبئی کے اونچے گھرانے سے تھا۔ دونوں نے لندن، کیمبرج اور جرمنی میں اکٹھے کافی وقت گزارا۔ اس زمانے کے نوجوان اقبالؔ کو یاد کرتے ہوئے مس فیضی نے کہا کہ وہ بڑے خلوت پسند اور اپنے کو منوا لینے والے انسان تھے جو کبھی کبھی متصوفانہ خیالات میں کھو جاتے تھے۔ اقبالؔ نے خود مس فیضی سے ایک بار کہا تھا کہ ''میں بہ ظاہر بہت عملی اور کارکرد قسم کا انسان ہوں مگر بہ باطن میں ایک صوفی ہوں''۔ عطیہ فیضی ایک نہایت حسین، ذہین اور اپنے وقت سے آگے کی خاتون تھیں۔ جب وہ لوٹ کر بمبئی آئیں تو اقبالؔ نے ایک نظم بعنوان ''وصال'' ان کی خدمت میں روانہ کی۔ وصال کے کچھ شعر پیش ہیں ؎

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
خود تڑپتا تھا چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں
میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا سیماب تھا
ارتکاب جرم الفت کے لئے بے تاب تھا
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے

(بانگ درا سے)

یہ تو خیر خیال وخواب کی دنیا کی باتیں تھیں۔ مس فیضی کے نام ایک خط میں اقبال نے کھل کر اعتراف کیا کہ ''ایک انسان کی حیثیت سے مجھے بھی خوشیاں حاصل کرنے کا حق ہے' جنھیں میں مرے اطراف بکھرے ہوئے کتابوں کے بے جان اوراق سے حاصل نہیں کرسکتا'' اور یہ کہ ان کی روح کے اندر ایسی سلگتی ہوئی آگ ہے جو ان کتابوں اور سماجی رسوم کو جلا کر راکھ کرسکتی ہے۔ مگر انھوں نے عطیہ کا ہاتھ نہیں تھاما۔ عطیہ نے ان پر بے گانگی اور چاپلوسی کے الزامات لگائے۔ اقبالؔ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ'' کاش میں اپنے باطن کو الٹ کر تمہارے سامنے رکھ سکتا کہ تم میری روح کو بہتر طور پر دیکھ سکتیں''۔ بہرحال اقبالؔ انجان ہی رہے۔

عطیہ فیضی نے بعد کے دنوں میں ہندوستان کی روایتوں کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے کہا کہ ''یورپ کا اقبالؔ' ہندوستان کے اقبالؔ سے بالکل مختلف تھا''۔ ہندوستان کے سماجی ماحول میں ان کی ذہانت سکڑ کر محدود ہوگئی تھی۔ فیضی نے ایک بار یہ بھی کہا کہ ''میں نے اقبالؔ کی ذہانت کی جو چکاچوند یورپ میں دیکھی تھی' ہندوستان میں اس کا حصہ بھی نظر نہ آیا''۔ حفیظ ملک کے خیال میں یہ شادی اس واسطے بھی ممکن نہ تھی کہ مس فیضی' روشن خیال خواتین کے ہراول دستے کی سردار تھیں اور اقبالؔ کے گھر کا پنجابی دیہات کا ماحول' ان دونوں میں کوئی میل نہ تھا۔ خود اقبالؔ بھی اپنے سے اونچے سماجی طبقے کی خاتون سے شادی کے لئے آمادہ نہ تھے۔

یورپ کی حرکیاتی توانائی نے اقبال کو بہت متاثر کیا۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ زندگی سے بھرپور چاق وچوبند لوگ ''پُراعتماد اضطراب کے ساتھ متحرک ہیں اور وہ جس چیز کو پسند نہیں کرتے اس کو بدل دینے پر قادر ہیں''۔ چنانچہ اب اقبالؔ نے حرکت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور سستی اور کاہلی پر طنز کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے کہنا شروع کردیا کہ وہ خورشید آرزو کی کرن کی طرح چمکیں اور سمندر کی بے تاب موج سے سبق حاصل کریں۔ جو یہ کہتی ہے کہ ؎

اگر میں چلتی ہوں تو زندہ ہوں
اور رک جاؤں تو فنا ہوجاؤں

''اپنی قوت عمل کی وجہ'' اقبالؔ نے لکھا ''مغربی اقوام پوری دنیا میں نمایاں مقام کی حامل ہیں۔ان کی زندگی کے اس راز کو پانے کیلئے ان کے افکار اور ادب کا مطالعہ مشرقی اقوام کی راہ نمائی کرسکتا ہے''۔ نہ صرف مغرب کی طرز حیات بلکہ ان کے افکار و فلسفے سے بھی واقفیت بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے برگساں کے نظریہ حرکت اور نطشے کی خود ادعائی فلسفے کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ان میں سے کچھ افکار کو انھوں نے قبول کیا اور کچھ کو رد بھی کیا۔

جہاں اقبالؔ نے مغرب کی طاقت کو سراہا وہیں انھوں نے مغربی افراد اور اقوام کے درمیان بڑھتی ہوئی سفاکانہ مسابقت کو سختی سے ناپسند کیا۔انھوں نے کہا کہ بے شک مغرب کے کچھ ملکوں نے سوشلزم کو اپناتے ہوئے مسابقت کو رد کیا ہے جس کو اقبالؔ نے جزوی طور پر پسند کیا۔مگر وہ اس بات سے غیر مطمئن تھے کہ دہریت بہر حال یورپی سوشلزم کے مجموعی نظام فکر کا حصہ تھی۔''مغرب میں محبت مر چکی ہے'' اقبال نے تبصرہ کیا'' کیونکہ وہاں کی فکر بے دین ہو چکی ہے''۔یورپ کے قیام کے دوران انھوں نے کہا ؎

پیر مغاں ! فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

اب ایک نئی دنیا کی تشکیل کیلئے اقبالؔ کی سوچ و فکر کسی مثالی ماڈل کی تلاش میں جٹ گئی ۔انھوں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ بغیر تباہ کاری کے کیا حرکت ممکن ہے؟ اور اقوام کے درمیان یکجائی کیا مسابقت کے بغیر بھی حاصل کی جاسکتی ہے؟ انھیں جواب ملا کہ ''اتنی زبردست توانائی کے باوجود یہ یورپ کے بس میں نہیں البتہ اسلام میں اس کا امکان ہے'' کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ عہد اول میں اسلام کے آگے قوم پرستی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔علاوہ ازیں نسل پرستی کے خلاف اقبالؔ اسلام کی قوت کے قائل تھے جو انسانیت نواز اقدار کے فروغ

اور اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اقبالؔ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ مختلف النوع فرقوں میں بٹا ہوا اور اکثر و بیشتر آپس میں الجھنے والا ہندوستانی معاشرہ نہ ہی ایک مثالی ماڈل ہے اور نہ ہی کبھی اسے یہ موقف حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظریں اسلام کے اولین عہد کے خلافت راشدہ کے معاشرے پر پڑیں اور انھوں نے خیال کیا کہ اگر اسلام کو صحیح تناظر میں سمجھ سکیں تو کل کے مسلمان قومیت کی حدوں سے اوپر اٹھ کر ایک مثالی معاشرہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ یورپ کے قیام کے دوران انھیں قوم کی تعریف پر نظر ثانی کا موقع بھی ملا تھا چنانچہ اب ان کی توجہ ہندوستانیوں سے ہٹ کر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں پر مرکوز ہوگئی۔

''جب اقبال نے یورپ کی پرکشش اور متحرک مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھا تو شاید اسلام کے فخریہ ماضی نے بھی ان سے کچھ کہا ہو اور شاید والد محترم کی بچپن میں کہی گئی یہ بات کہ ''تو شاخسار مصطفیٰؐ کا ایک غنچہ ہے'' بھی یاد آ گئی ہو۔ اقبالؔ نے اس بسیط تبصرے کو بھی قبول کرلیا تھا کہ ''مغربی فکر از منہ وسطیٰ کے اسلام کے شاندار دانشورانہ تہذیب کی جانشین ہے جو سسلی اور اسپین کی راہوں سے یورپ پہنچی تھی۔ اس تاریخی پس منظر سے یورپ میں ہندوستان لوٹتے ہوئے انھوں نے دو نظمیں کہیں تھیں۔ پہلی نظم کے اشعار ہیں ؎

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دوسری نظم انھوں نے اس وقت کہی جب جہاز کے عرشے سے ان کی نظر سسلی کے جزیرے پر پڑی اور انہیں اسلام کی علمی تہذیب کی روایات یاد آ گئیں۔ اس نظم کا عنوان ہے ''صقلیہ'' ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونبار

وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مردہ عالم ' زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے ؟

درد اپنا مجھ سے کہہ ' میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا ' میں اس کارواں کی گرد ہوں

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں ' اوروں کو وہاں رلواؤں گا

یورپ سے واپسی کے فوراً بعد امرتسر کی ایک ہندو' مسلم' سکھ انجمن نے انہیں ایک عہدے کی پیشکش کی جسے انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور اپنے انکار کی توجیہ یوں بیان کی کہ:

''میں اس خیال کا حامی ہوں کہ اس ملک سے مذہبی اختلافات کو ختم ہونا چاہئے چنانچہ اپنی نجی زندگی میں' میں اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ مگر میرا یہ بھی خیال ہے

کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے فرقوں کی شناخت کا تحفظ بھی کرنا چاہئے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ۔ ہندوستان میں مشترکہ قومیت کا تصور ایک بہت خوبصورت مقصد ہے اور اس میں شاعرانہ کشش بھی ہے ..... مگر لگتا ہے کہ یہ ایک ناقابل حصول مقصد ہے''۔

کریم بی سے اقبالؔ کی شادی ناکام رہی ۔''میں نہایت مصیبت کی زندگی گزار رہا ہوں''۔انھوں نے لندن سے واپسی کے فوری بعد 1909ء میں مس فیضی کو ایک خط میں لکھا کہ''ان لوگوں نے مجھ پر ایک عدد بیوی کو لاد دیا ہے''۔ بیوی سے طویل دوری اور مس فیضی سے قربت بھی اس کرب کو دور کرنے میں مددگار ثابت نہ ہوئی ۔ 1916ء میں کریم بی' اقبالؔ سے دور ہو گئیں مگر اقبالؔ نے اپنی آخری سانس (1938ء) تک ان کی کفالت کی ذمہ داری نبھائی ۔ کریم بی 1946 میں گزر گئیں ۔ 1909ء میں اقبال نے دو اور شادیاں کیں ۔ سردار بیگم اور مختار بیگم سے ۔ لیکن اقبالؔ' سردار بیگم کو گھر نہیں لے آئے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سردار بیگم سے ان کی شادی نہیں صرف منگنی ہوئی تھی مگر سردار بیگم کا خیال کچھ اور تھا ۔ انھوں نے اقبالؔ کو خط لکھ کر ان کی خوب خبر لی''میں آپ سے بیاہی گئی تھی اور اب میرا دوسرا نکاح بھی ممکن نہیں ۔ میں مرتے دم تک اسی حالت میں رہوں گی اور حشر کے دن آپ کو اپنی تباہی کا ذمہ دار قرار دوں گی''۔ اس خاتون کے عزم نے رنگ دکھایا ۔ اقبالؔ نے 1913ء میں سردار بیگم سے شادی کی یا پھر ان سے دوسری شادی کی ۔ مختار بیگم 1924ء میں رحلت کر گئیں ۔ سردار بیگم 37 سال کی عمر میں اپنی محبت اور سپردگی کی دو نشانیاں یعنی ایک بیٹا (جاوید) اور بیٹی (منیرہ) اقبال کو نذر کر کے 1935ء میں چل بسیں ۔

آلائشوں سے پاک''خالص اسلام'' اقبال کی سوچ وفکر کا جواب تھا ۔ یہ خالص اسلام اس''بگڑے ہوئے اسلام'' سے مختلف تھا جسے مسلمانوں کی اکثریت بلکہ خود اقبالؔ بھی اپنی

زندگی میں برتتے آرہے تھے۔مگراب اقبال نے سوچا کہ خالص اسلام میں نہ ہی ولیوں اور صوفیوں کا کوئی مقام ہےاور نہ ہی درگاہوں کے احترام کی روایت۔حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں تصوف کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں ایران کی مابعد الطبیعات پر تحقیق کے دوران یہ بات ان پر منکشف ہوگئی تھی کہ اسلام میں تصوف کے لئے کوئی تاریخی مواد موجود نہیں ہے۔اپنے ایک قریبی دوست خواجہ حسن نظامی (جو نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے متولی تھے) سے انھوں نے درخواست کی کہ وہ انھیں قائل کریں کہ تصوف اسلام کے بنیادی عقائد سے ہم آہنگ ہے۔خواجہ حسن نظامی نے جو مواد انہیں فراہم کیا اس سے اقبالؔ مطمئن نہیں ہوئے۔انھوں نے بہرحال یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تصوف نہ صرف اسلام کے لئے اجنبی ہے بلکہ غیر صحت مند رجحانات کی پیداوار بھی ہے۔تاہم اقبالؔ گاہے گاہے ہی سہی تصوف اور اسلامی عرفان کا ذکر کرتے رہے ہیں اور اپنے مرد کامل کے فلسفے کے فروغ میں انھوں نے تصوف کی ایک اصطلاح یعنی عشق کا کثرت سے استعمال بھی کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے ایران کے مشہور شاعر حافظ شیرازی پر کڑی تنقید بھی کی تھی۔

عالموں کی رائے لفظ ''تصوف'' کی ابتداء کے بارے میں منقسم ہے۔بعض کا خیال ہے کہ اس کی اصل صوف (اُون) سے ہے یعنی وہ کپڑا جسے اگلے زمانے میں صوفی اوڑھتے تھے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ یہ صفا (پاکی) سے ماخوذ ہے جس کا حصول صوفیاء کا عظیم مقصد رہا ہے۔ طریقت کے ماہرین دائرے کی مدد سے طریقت اور شریعت کے درمیان تعلق کو بیان کرتے ہیں۔ایران کے مشہور اسکالر ابوحسن نصر نے تصوف کو اپنے انداز میں یوں سمجھایا ہے:

> ''دائرے کا محیط سارے فرقے کو ایک کُل کی طرح گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ہر مسلمان خدائی قانون کو قبول کرنے کی وجہ محیط پر کسی نہ کسی مقام پر ایک نقطہ کی طرح موجود ہے۔اس دائرے کے تمام نصف قطر' طریقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ہر نصف قطر' محیط سے مرکز کی طرف ایک راستہ ہے۔جیسا کہ صوفی حضرات سمجھاتے ہیں کہ خدا کی طرف جانے کے

اتنے ہی راستے ہیں جتنی کہ اولادِ آدم کی آبادی ہے۔ مرکز پر بہرحال حق یعنی سچائی موجود ہے جو شریعت اور طریقت دونوں کا مبداء ہے۔ قانون (شریعت) اور راستے (طریقت) کا اپنی اپنی جگہ آزادانہ وجود خدا کا مرہون ہے جو خود سچ ہے۔ شریعت کو برتنے کا مطلب ہے کہ مرکز کے سائے میں زندگی گزارنا۔ عام انسانوں کے لئے اس طرح کی زندگی گزارنا محفوظ بھی ہے اور ضروری بھی..... اس کے باوجود کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو مرکز کے سائے سے نکل کر خود اس کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ان کا اسلام یہ ہے کہ وہ ایک راستے پر سفر کرتے ہوئے مرکز کی طرف بڑھ رہے ہیں ..... تاکہ اپنے آخری مقصد کو حاصل کر سکیں۔''

تصوف کی کشش کو سمجھنا مشکل بھی نہیں۔ اس میں ہر فرد کو خدا کی طلب کا جواب مل جاتا ہے۔ یہ گزرتے لمحات سے زیادہ جاودانیت' اطاعت سے زیادہ محبت' عمل سے زیادہ نیت اور الفاظ سے زیادہ اس کی روح اور معنی پر زور دیتا ہے۔ یہ شاعری میں اُبل کر اس کو اصابت عطا کرتا ہے۔ مگر ایک اور اسکالر فضل الرحمٰن کو اعتراف ہے کہ صوفی کی روحانیت بہرحال ایک قسم کا روحانی بگاڑ بھی پیدا کرتی ہے۔ مذہبی علماء کے کٹر پن' شرعی قوانین کی سختی اور دینی امور میں ظاہری رسوم پر زور کے باوجود مذہب پسند تخلیقی ذہنوں کو تصوف نے اپنی طرف ضرور مائل کیا ہے۔ یہاں رحمان صاحب گیارھویں اور بارھویں صدی کے حالات کے حوالے سے بات کر رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات کسی وقت بھی رونما ہو سکتے ہیں اور کئی بار رونما ہو چکے بھی ہیں۔

تصوف کے خطرات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ طریقت کی منزل کی تلاش اور اضطراب میں شریعت کو بھلایا بھی جا سکتا ہے۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنے کہ آدم کے بیٹے' تو پھر ایسی صورت میں اسلام کی اپنی شناخت اور استحکام کا کیا ہوگا؟ جیسا کہ صوفی حضرات کہتے ہیں کہ صوفی کا بہرحال رہنما تو اس کی ''اپنی باطنی روشنی'' ہے

تو پھر اس خطرے کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ انتہائی صورتوں میں کہیں افراتفری نہ پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ فضل الرحمٰن بتاتے ہیں کہ صوفی ان پر منکشف حقیقتوں کا عرفان رکھتے ہیں' اپنے نا قابل اصلاح طریقوں سے علم و دانش تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور علمائے دین کی عائد کردہ پابندیوں سے خود کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر اسمتھ کہتے ہیں کہ تصوف ایک ''ولی کی پرسکون بصیرت'' اور کسی نیم جاہل کی ''اضطراری یاوہ گوئی'' کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ابتداء ہی سے صوفی اپنے عقائد اور اعمال کی بابت قرآن کے حوالے دیتے رہے ہیں۔

تصوف کی تاریخ میں عظیم اسکالر الغزالی (وفات ۱۱۱۱ء) کا علمی کارنامہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ انھوں نے علماء سے تصوف کی توثیق حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ الغزالی خود عہد وسطیٰ کے ایک صوفی اور تصوف کے بڑے مصلح بھی تھے۔ انھوں نے تصوف کا رشتہ قدامت پسند مذہب سے جوڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے کئی صوفیوں کی سرزنش بھی کی جو مستقل' ایک وجد آفریں سرمستی کی تلاش میں رہتے تھے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ تصوف کا مقصد صرف اسلام کی سچائی کو آشکار کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ الغزالی نے یہ بھی کہا کہ صرف ''قلب کی زندگی'' سے ایمان کی منزل تک رسائی ممکن نہیں۔ مشکل یہ آپڑی کہ الغزالی کی متوازن رہ کو اختیار کرنے کے لئے نہ ہی علماء تیار تھے اور نہ ہی صوفیوں نے ان کی راہِ سلوک کو قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اس طرح اسلام میں یہ مسئلہ یوں ہی باقی رہا کہ تصوف پر نہ ہی پابندی عائد کی جاسکی اور نہ ہی اسے مکمل آزادی حاصل ہوئی۔

عہد وسطیٰ کی دوسری اہم شخصیت ایک عرب فلسفی ابن العربی (۱۲۴۰ء۔۱۱۶۵ء) ہیں جو اسلام میں تصوف کی مشکلات کی علامت بن گئے۔ قرآن کی روشنی میں ابن العربی نے توحید کے روحانی اور فلسفیانہ مطالب کی تفہیم کی۔ توحید کی روحانی سطح پر انھوں نے یہ تشریح کی کہ ہر مسلمان خدا کی ذات میں اتحاد کا متلاشی ہوتا ہے اور اس کے فلسفیانہ معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے وجود

کو خدا کے حوالے کر دے جسے تصوف کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہتے ہیں ۔ خدا جو باطن میں موجود ہے اور یہ کائنات اس کے ظاہری پہلو کا مظہر ہے ۔ اگر ہم گہرائی میں جا کر غور کریں تو ابن العربی کا یہ مطلب ہے کہ ہر انسان اُلوہیت کے قریب ہوتا ہے یا اس تک پہنچ سکتا ہے ۔ اپنے اس خیال کی تائید میں ابن العربی نے قرآن کی روشنی میں یہ شہادت پیش کی کہ خدا ہر انسان کی شہ رگ کے قریب ہے اور حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنی شبیہ میں بنایا ہے ۔ تخلیص پسندوں نے ابن العربی پر یہ الزام لگایا کہ اس طرح وہ یونانیوں کے فلسفہ ''ہمہ اوست'' کی تعلیم دے رہے ہیں لیکن بعض علماء نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا ۔ مگر ہوا یہ کہ ابن العربی کے خیالات مسلمانوں میں اتنے عام ہو گئے کہ ایک اسکالر نور الدین کے خیال میں تقریباً سبھی پڑھے لکھے افراد جو تصوف کی طرف میلان رکھتے تھے ابن العربی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ چنانچہ عربی، فارسی اور اردو شاعری میں وحدت الوجودی خیالات کثرت سے در آئے ۔ نور الدین نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس طرح ابن العربی نے مسلم تصوف کو ہیلانیت یا یونانیت (یونائیت) (Hellinism) میں رنگ دیا ۔ درحقیقت ابن العربی کی زبردست تخیل پرست ذہانت نے بھی تصوف کے ان خیالات کو مقبول بنانے میں بڑا رول ادا کیا ۔ جیسا کہ رحمان نے بتلایا کہ ابن العربی اس لئے بھی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے کہ عربی زبان میں توحید کا لفظ یکتائی اور اتحاد دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔

العربی کے بعد ایک اور صوفی شاعر جلال الدین رومی (وفات ۱۲۷۳ء) نے تصوف کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ۔ ان کی تصنیف ''مثنوی'' شاعرانہ حسن کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

ہست قرآں در زبان پہلوی (فارسی زبان میں قرآن)

رومی جانتے تھے کہ کس طرح تخلیص پسندوں (Purists) سے نمٹنا چاہئے ۔ رومی نے خدا کی بات موسیٰ کی زبان سے کہلوائی کہ ''میں نے ہر ایک کو ایک خاص قسم کی طرز حیات سے

نوازا ہے اور میں نے ہر شخص کو اظہار کا ایک منفرد اسلوب بخشا ہے اور یہ کہ ہندوستان کا محاورہ ہندوؤں کے لئے مناسب ہے''۔ کچھ کم ۵۰۰ سال کے بعد سندھ کے شاہ عبداللطیف نے پھر اسی ''غلطی'' کا اعادہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''جب سچائی ایک ہے اور محبوب بھی وہی ہے تو پھر رسائی کے وسیلوں کی لڑائی کیوں؟'' جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کس مذہب کے پیرو ہیں تو انھوں نے جواب دیا ''تمام کا یا پھر ایک کا بھی نہیں''۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صرف رومی اور لطیف ہی نہیں بلکہ اور بھی تھے جو قول و فعل کے پکے تھے۔

مستقبل کے ہم عصر تخلیص پسندوں نے بھی ان حضرات پر الزام لگایا کہ انھوں نے اسلام کو ہلکا کر کے انتشار پیدا کیا اور اس کی روح کو نقصان پہنچایا۔ مغل اعظم' شہنشاہ اکبر خود ایک عظیم اصطفائی (ECLECTIC) تھا جو خود اس رجحان کا حامی تھا۔ اس جارحانہ رجحان کا شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۴-۱۵۶۴) نے اپنے علم و دانش کے ذریعہ زبردست مقابلہ کیا۔ خود ایک صوفی ہوتے ہوئے انھوں نے اسلام کو یونانی فلسفے' ایرانی تصوف اور ہندوستانی مصلحت پسندی سے آزاد کیا۔ اس طرح وہ تخلیص پسندوں کے ہیرو بن گئے۔ آج تک بھی وہ تخلیص پسندوں میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

ایک صوفی کے فرزند ہونے کی وجہ سے اقبالؔ' العربی کے اشعار اکثر و بیشتر پڑھتے رہتے تھے۔ انھوں نے قادریہ سلسلے میں اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اگرچیکہ تصوف سے ان کی دوری بڑھ رہی تھی۔ بعد میں میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں مقالہ لکھنے کے دوران انھوں نے العربی کو خراج عقیدت بھی پیش کیا تھا لیکن اب وہ ڈرامائی طور پر بالکل بدل گئے تھے۔ اب انھوں نے تصوف سے یکسر انکار کر دیا۔ پیری مریدی کو ترک کیا۔ العربی سے بھی دوری اختیار کی۔ اکبر اعظم کی مذاہب کی آمیزش پر تنقید کی اور اپنی اردو نظم میں شیخ سرہند کی خدمت میں نذرانۂ تشکر پیش کیا ؎

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
(بال جبرئیل سے)

اقبالؔ نے اپنی ایک خانگی ڈائری میں لکھا کہ ''اپنے پیش روؤں کی تاریخ سے (اکبر اعظم کے برعکس) اورنگ زیب نے یہ سیکھا کہ ہندوستان میں اسلام کی قوت عوام کے جذبۂ خیر پسندی سے زیادہ حکمرانوں کی قوت پر منحصر ہے''۔ جیسا کہ ٹینسی سن نے لکھا کہ اکبر جزیہ سے اس لئے دست بردار ہوا کہ وہ بے یقین لوگوں کے کھیت سے کوئی ٹیکس حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا''۔ مگر اقبالؔ نے اورنگ زیب کو سراہا ہے۔

''کفر و دین کے معرکے میں وہ ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ ہند کے بت خانے میں ابراہیم کی طرح تھا''۔ (آزاد ترجمہ۔ رموز بے خودی سے)

اقبالؔ کی تخلیص پسندی میں، اگر ہم کہہ سکیں تو، ایک پُرکشش متناقضانہ قسم کی انسانیت تھی ۔۱۹۲۳ء میں وہ شیخ سرہند کے مزار پر گئے اور اپنے لئے ایک فرزند کی پیدائش کے لئے دعا مانگی ۔ دوسرے ہی سال انھیں ایک بیٹا تولد ہوا۔ بیٹا جب 10 سال کا ہوا تو انھوں نے بیٹے کے ساتھ شیخ سرہند کے مزار پر حاضری دی۔ جاوید نے اس پورے واقعہ کو یوں بیان کیا:

''والد مجھے اپنے ساتھ مزار پر لے گئے۔ قبر کے پاس بیٹھ کر انھوں نے قرآن کی تلاوت کی۔ غم میں ڈوبی ہوئی ان کی مرتعش آواز تاریک گنبد میں گونجتی رہی اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کے گالوں پر بہہ رہے تھے''۔

اقبالؔ نے تصوف کی اس لئے بھی پرزور مخالفت کی کہ بہت سے صوفیوں نے شریعت (دائرے کے محیط) کو بھلا دیا تھا اور محیط کے نقطے سے نکل کر نصف قطر پر سفر کرتے ہوئے وہ محض مرکز (یعنی خدا) کی جانب بڑھ رہے تھے۔ صوفیوں نے اس خیال کی بھی حوصلہ افزائی کی کہ سارے ادیان ایک ہیں۔ ان کا یہ رویہ بڑی حد تک مشرکانہ تھا اور اس ویدانتی نقطہ نظر جیسا تھا کہ سب راستے بہر حال ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ صوفیوں کے زیر اثر اسلام قبول کرنے والوں نے بھی بت پرستی کی مختلف شکلوں کو ترک نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں بدھسٹوں اور ہندوؤں کی طرح، صوفیوں نے بھی اس نظریے کی تلقین کی کہ فرد فنا ہو کر ایک بڑے وجود (خدا) میں مدغم ہو جاتا ہے جیسا کہ قطرہ، سمندر میں مل کر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اقبالؔ چاہتے تھے کہ انسان، قطرۂ آب کی طرح فنا ہونے کے بجائے موتی بن کر ابھرے۔ بندہ، بندے کی طرح باقی رہے اور خدا کی ذات میں ضم نہ ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان خود پر فتح پائے نہ کہ ایک بڑی ذات میں مٹ کر فنا ہو جائے۔ عبادت انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ خدا کے حوالے سے اپنے موقف کو سمجھ سکے۔ مگر اس کا خدا کے ساتھ وصل نہ ہی ممکن ہے نہ مطلوب۔ تصوف کے بارے میں اقبالؔ نے وضاحت سے کہا کہ:

> ''تصوف ہمیشہ سے ہی اقوام کے زوال کی علامت رہا ہے۔ تصوف ایرانی ہو کہ یونانی کہ ہندوستانی ان اقوام کے زوال کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح یہ بات اسلامی تصوف پر بھی صادق آتی ہے۔ ہر وہ فلسفہ یا مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے پھلنے پھولنے میں حارج ہو بے سود ہے''۔

اقبالؔ چاہتے ہیں کہ انسان خدا کی صفات اپنائے تا کہ وہ خدا کو معاون کار کی طرح قبول کرے۔ اس کے باوجود اقبالؔ دوری یا فراق کے قائل ہیں ؎

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجرت میں لذت طلب

اس کے باوصف کیا اقبالؔ کا انسان دائرے کے محیط پر کھڑا مطمئن ہے کہ اس کی شخصیت کا ایسا فروغ ہو کہ وہ خدا کے مقابل اپنے موقف کا تعین کرے مگر یوں کہ الوہیت نہ ہی اس سے مَس ہو اور نہ بغل گیر؟ اقبالؔ کا مغرور حق پرور، پھلتا پھولتا اور فتح مند انسان ایسا بھی نہیں کہ غیر انسان ہے جو الوہیت سے قرب کا غیر متمنی ہے۔ فراق کا یہ پیغمبر یا رسول، وصل کے بجائے ایک ایسی خوش تدبیری سے خدا سے مربوط ہونا چاہتا ہے جس میں انسان کے منکسرانہ موقف کا اعتراف نہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ اقبالؔ کا انسان ہرگز پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنا سر خدا کے کاندھوں پر رکھے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خدا خود اس کی شخصیت میں امان پائے ؎

ایک ہزار اعمال سے
زیادہ فرحت بخش یہ ہے کہ
تو اور میں
ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں
آ، اور کچھ دیر کے لئے
میرے سینے میں سما جا
اپنی خدائی کی مشقت بھری تکان
سے نکل کر!

(آزاد ترجمہ)

ایسے بھی مقامات ہیں جہاں اقبالؔ ایک صوفی کی طرح بات کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا یہ کہنا ''ایمان، خدا مستی'' ہے یا یہ کہ ایمان انسان کو اتنی طاقت عطا کرتا ہے کہ وہ ''ابراہیم کی طرح آگ میں جل سکتا ہے''۔ اقبالؔ اگرچیکہ تصوف پر لعن طعن کرتے ہیں مگر اس ایجابی حوالے پر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ وہ ''اسلامی تصوف'' کے قائل ہیں جس میں اُلوہی احکامات کی تعمیل شخصی آرزوؤں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ ان کے قریبی دوست مرزا جلال الدین نے جو اقبالؔ کو اگر ولی نہیں تو صوفی ضرور سمجھتے تھے۔ کہا تھا کہ :

''اپنی زندگی کے آخری دنوں میں' اقبال بڑی حد تک دنیا سے دست کش ہو چکے تھے اور ایک درویش کے طور طریق اپنا چکے تھے۔ مادی دنیا سے بے خبر وہ اپنی روحانی مسرتوں میں گم رہنے لگے تھے''۔

ہم ابھی تک اقبالؔ کے پیام کا اسلامی فکر کے تاریخی تناظر میں تعین نہیں کر سکے ہیں۔ ایسا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان کے فلسفہ خودی کا بھی جائزہ لیں جس کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں اور اسلام کے بارے میں بھی ان کے ارشادات پر بھی نظر ڈالیں۔ برصغیر کے اسلامی جدیدیت کے سب سے بڑے مفکر فضل الرحمٰن جو خود تخلیص پسند ہونے کے علاوہ بنیاد پرست جماعت اسلامی کے بھی نقاد ہیں' کا خیال ہے کہ اقبالؔ کی تعلیمات نے بڑی حد تک احیاء پسندی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

اب ہم اس موقف میں ہیں کہ اعتماد کے ساتھ اقبالؔ کے بارے میں یہ کہہ سکیں کہ وہ کیا نہیں تھے۔ بہ قول مورخ تارا چند' اقبالؔ مذہبی سچائی کے ان کھوجیوں میں نہیں تھے جو ہندو مفکروں کے ساتھ چل کر اپنی تلاش میں یکسانیت پا کر مذہبی شعور کی گہرائی میں کوئی امتیاز محسوس نہ کرتے ہوں۔

اقبالؔ نے کبیر داس کی طرح کبھی یہ نہیں سوچا کہ مسلمان کی نماز اور ہندو کی پوجا میں کوئی خاص فرق نہیں اور نہ ہی اکبر اعظم کے وزیر ابوالفضل کی طرح ہندوؤں کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ:

''تمام ہندو خدا کی یکتائی پر یقین رکھتے ہیں۔ اگرچہ کہ وہ تصویروں کو پوجتے ہیں لیکن وہ مشرک نہیں۔ میں نے ان کے مذہبی عالموں سے اکثر اس مسئلے پر گفتگو کی ہے۔ مجھے ہندومت کا یہ اصول سمجھ میں آیا کہ وہ سب خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ تصویریں تو ان کے سامنے رکھی علامتیں ہیں تاکہ عبادت کے دوران ان کے خیالات منتشر نہ ہوں''۔

''خودی کا نظریہ ہمیں اقدار کا ایک معیار عطا کرتا ہے''۔ اقبالؔ نے اپنی کتاب ''اسرار خودی'' میں لکھا ہے کہ ''یہ نیکی اور بدی کی آخری کسوٹی ہے۔ جس سے خودی مستحکم ہوتی ہے اور جس سے کمزور ہو بدی ہے''۔ انھوں نے جامد راہب کو حقارت کی نظر سے دیکھا جبکہ وہ مضطرب مہم جو کی تحسین کرتے ہیں۔ وہ تناؤ کو حرکت کی علامت اور سکون کو خواب آور سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں طاقت ور شخصیتیں ہی مستقبل میں مثالی معاشرے کی تشکیل کریں گی۔ ''تلوار سے خودی کا سر قلم کرو'' رومی نے کہا تھا۔ اردو، فارسی اور ہندی شاعروں نے بھی عام طور پر ''خودی کے قید خانے'' سے آزادی کی تمنا کا اظہار کیا مگر اقبالؔ نے اس خودی سے انا کا صنم تراشا۔ بعد میں انھوں نے وضاحت کی کہ اس کا ہرگز مطلب نہ غرور ہے اور نہ ہی انا پرستی بلکہ اس کے معنی ہیں خود شناسی اور خود ادعائیت۔ یہ ایک ایسی گہری جبلت ہے جو ہر انسان کے اندر خاموش قوت کی صورت میں موجود ہے اور جو ابھر کر عمل کی دنیا میں آنے کے لئے بے چین رہتی ہے۔ ''اسرار خودی'' کے انگریزی ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور انگریزی ادیب ای۔ ایم۔ فاسٹر نے لکھا تھا :

> اقبال، نطشے سے متاثر ہیں۔ وہ زندگی کی نازک پیچیدگیوں سے نمٹنے کے لئے فوق البشر جیسے متذبذب آدرش سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اشعار کے ذریعہ ہمیں زندگی کے خطروں سے کھیلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم کانچ کی بجائے پتھر کے بن جائیں، ریشمی قطروں کی جگہ ہیروں میں ڈھل جائیں اور بھیڑوں سے شیروں میں بدل جائیں۔ یورپ میں عملی زندگی کو برتنے کے معاملے میں نطشے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ مزید برآں فوق البشر بننے میں ایک علت یہ ہے کہ آپ کا پڑوسی بھی آپ کو دیکھ کر خود بھی فوق البشر بننے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

اقبالؔ نے نطشے کو سراہتے ہوئے لکھا کہ وہ الوہی بصیرت'' حاصل کرنے کا اہل تھا لیکن

انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ نطشے کے فوق البشر سے کہیں زیادہ تصوف کے انسان کامل کے نظریے سے متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے جس شخصیت کو اقبالؔ پسند کرتے ہیں وہ نطشے کے فوق البشر سے کافی مختلف ہے۔ اس کا تعلق اشرافیہ سے نہیں بلکہ عام لوگوں سے ہے جو عوام کی صفوں سے ابھر کر سب پر حکمرانی کا اہل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کا ہیرو' معاشرے کے کسی بھی طبقے سے ابھر سکتا ہے' اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ معاشرے کے تمام افراد طاقتور اور با مقصد شخصیتوں کے مالک بنیں۔ جہاں نطشے کی دنیا سے خدا غائب ہے وہیں اقبالؔ کے طاقت ور افراد اپنی صلاحیتوں کو اس طرح نکھارتے ہیں کہ وہ بالآخر ''انائے مطلق''، یعنی خدا کی صفات سے متصف ہو جاتے ہیں۔

اس کے باوجود اقبالؔ اپنی زندگی میں طاقتور شخصیتوں سے بھی مرعوب ہوتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں مسولینی سے ملاقات کے بعد اس آمر کی طاقت کو سراہا اور اس کی تعریف میں ایک نظم کہی۔ انھیں مسولینی کی ''روشن آنکھوں میں مقناطیسی کشش'' نظر آئی (اسی زمانے میں گاندھی جی نے بھی مسولینی سے ملاقات کی اور اس کی آنکھوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ وہ بڑی سفاک تھیں)۔ ۱۹۲۰ء کے دہے میں ترکی کے مصطفیٰ کمال کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اپنی قوم کو اندھے عقیدے کی نیند سے جگایا اور خود شعوری کے جذبے کو بیدار کیا۔ لیکن جب مسولینی نے ابی سینیا (موجودہ حبش) پر حملہ کیا تو اقبالؔ اس پر بپھر گئے۔ اور بعد میں ترکی کے مصطفیٰ کمال کی آمریت سے بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا۔

مری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نسیم صبح ' چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اقبالؔ نے ماضی کے جس اسلام پر فخر کیا وہ دمشق'

بغداد اور اسپین کی پرشکوہ سلطنتیں نہیں تھیں بلکہ ''اولین دور کے خلفائے راشدین کی سیدھی سادی جمہوری حکومتیں تھیں''۔ جنگوں سے فتوحات کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ ''دوسری اقوام کی طرح مسلمانوں نے بھی لڑائیاں لڑیں اور فتوحات حاصل کیں مگر اس بات سے انکار مشکل ہے کہ کچھ حکمرانوں نے مذہب کی آڑ میں ملک گیری کے منصوبوں کی بھی تکمیل کی۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اسلام کے حقیقی پروگرام میں کبھی بھی ملک گیری کی ہوس شامل نہیں تھی''۔ اقبالؔ کو خوب اندازہ تھا کہ تلوار کی کامرانی کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے ؎

کڑکا سکندر بجلی کی مانند
تجھ کو خبر ہے اے مرگ ناگاہ
نادرؔ نے لوٹی دلی کی دولت
اک ضرب شمشیر ! افسانہ کوتاہ

(''محراب گل کے افکار''۔ ضرب کلیم)

اقبالؔ نے شخصیت کے فروغ کو صرف مردوں تک محدود رکھا ہے۔ اسمتھ نے بھی اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ''اپنے بہترین شاعرانہ' ترقی پسندانہ اور یوٹو پیائی (UTOPIAN) لمحوں میں بھی اقبالؔ اپنی فعال اور متحرک دنیا میں خواتین کو جگہ دینے سے قاصر ہیں''۔ آگے چل کر اسمتھ نے لکھا کہ وہ ''نہ ہی خواتین کو سرگرم دیکھنا چاہتے تھے اور نہ ہی وہ ان کی آزادی کے قائل تھے''۔ ان کی بیویاں ہمیشہ پردے میں رہیں اور وہ زندگی بھر بے تکان دنیا کو مثالی خاتون کا درس دیتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر (جن کو وہ مثالی خاتون سمجھتے تھے) کے بارے میں اقبال نے ایک فارسی نظم میں یوں خراج عقیدت پیش کیا ؎

تسلیم و رضا کی کھیتی کا حاصل بتولؓ ہے اور وہی ماؤں کے لئے ایک اسوہ کامل بھی
۔ایک محتاج کے لئے اس کا دل اتنا متاثر ہوا کہ اپنی چادر ایک یہودی کو بیچ دی۔
نوری (جنت) اور ناری (دوزخ) دونوں اس کے فرماں بردار' مگر اس کی رضا

اپنے شوہر کی رضا میں گم، جو صبر و رضا کی ادب پروردہ تھی، چکی پیستی اور ہونٹوں پر قرآن جاری رہتا۔ (رموز بے خودی۔ آزاد ترجمہ)

اپنی آخری طویل شاہ کار مثنوی ''جاوید نامہ'' میں اقبالؔ نے ایک مغرب زدہ خاتون کو بڑے ہی طنزیہ اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے جو سیدھی سادی خواتین سے یوں مخاطب ہوتی ہے ؎

اے زناں ' اے مادراں ' اے خواہراں
زندگی کب تک مثالِ دلبراں
دلبری ہے جگ میں مظلومی کا نام
ہے یہ محکومی و محرومی کا نام

حقیقت تو یہ ہے کہ اقبالؔ خود اس مسئلے کی گمبھیرتا سے خوب واقف تھے، لیکن ان کے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے خود کہا ؎

میں بھی محرومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت
سخت دشوار ہے اس عقدۂ مشکل کی کشود
(ضرب کلیم سے)

عین ممکن ہے کہ ہم کو اقبال کے نظریۂ خودی میں کچھ جھول نظر آئیں۔ اسلام کا مطلب ہے مکمل اطاعت یا سپردگی۔ اقبال، خواتین میں تو اس جذبے کی تحسین کرتے ہیں مگر مردوں کے لئے اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ اقبال کی خواہش ہے کہ مردوں میں بلند آہنگی، ادعائیت اور جذبہ مبارزت پیدا ہو۔ ہمیں اعتراض نہ ہوتا، اگر اقبالؔ اس خواہش کا اظہار ہر ایک کے لئے کرتے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ توانا شخصیتیں اپنے اطراف کمزور افراد کو مرعوب کر کے ان کے لئے نقصان رساں بھی ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی انسان فطرت پر قابو پاتا ہے تو ہم اس کی جرأت کی داد دیتے ہیں لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں وہ کبھی کبھی خود اپنے مزاج پر بھی قابو رکھے۔

زندگی کو خوش آمدید کہنا تو مستحسن ہے مگر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی سفاکانہ آرزوؤں کو بھی رد کرتا رہے۔ کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ کمزور لوگوں کو توانا افراد کی زیادتیوں سے بچایا جائے؟ اقبالؔ اس مسئلے کا جزوی یا مکمل حل شریعت یا قانون کے نفاذ میں دیکھتے ہیں جس کی مدد سے انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ حل تجویز کرتے ہیں تو ان میں وہ سرگرمی نظر نہیں آتی جو خودی کی تلقین کے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہ جب خودی کے گن گاتے ہیں تو اک مہم جو کی طرح بہت جذباتی ہو جاتے ہیں لیکن جب جو شریعت کی یاد دہانی کراتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی فرض شناسی کے ساتھ کسی سچائی کو دہرا رہے ہیں۔ اس میں عشق یا محبت کا وہ پہلو مفقود ہوتا ہے جس پر زور دینے سے شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے اور جو پڑوسی کی بھی شخصیت کے فروغ میں ممد و معاون ہوتا ہے۔

کون ہے جو مشرق کی انفعالیت یا مجہولیت سے انکار کرے۔ اقبالؔ نے بھی بڑی سرگرمی اور ذکاوت سے اس پر حملہ کیا ہے۔ انھوں نے نہایت سخت اور عمومی انداز میں مشرق پر تنقید کی جس کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خود اعتمادی اور مہم بازی سے مملو اقبالؔ کا انسان بھی احساس تنہائی اور کم مائیگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں نائب خدا کا منصب تو انسان کا مقدر ہے مگر اقبالؔ کا انسان کبھی کبھی محض ایک ''ذرۂ خاک'' یا ''قابل رحم مخلوق'' کی مانند بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایک جگہ خود اقبالؔ نے خدا سے سوال کیا کہ ؎

یہی آدم ہے سلطاں ' بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں ' نے خدا بیں ' نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا ؟

(رباعی۔ بال جبرئیل)

اقبال قطعی طور پر ایسے مسائل چھیڑ کر یا تو اپنے شبہ کا اظہار کرتے ہیں یا پھر کسی قسم کی مخفی ترمیم کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک امریکن اسکالر شیلا میک ڈوناف لکھتی ہیں کہ ''اقبال اپنے افکار اور خیالات کی محدودیت سے باخبر تھے جو انھیں یا کسی بھی فنکار کو کاز ماس کی بھیانک اجنبیت کے روبرو کر دیتی ہے''۔ اس کی بابت اس نے اقبال کی ایک اہم تحریر کو پیش کیا:

> جیسا کہ دریا کے ساحل پر اگنے والے پودے کو پانی کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے اس شیریں اور نقرئی نغمے کا علم نہیں ہوتا جو اس کی پرورش کرتا ہے' اسی طرح لامحدودیت کے کنارے پھلنے پھولنے والے انسان کو ان الوہی مدہم سروں کی بھی آواز سنائی نہیں دیتی جو اس کی روح کو زندگی اور آہنگ فراہم کرتے ہیں۔

ہمیشہ نمو پاتے ہوئے اور ہمیشہ مائل بہ سفر اقبال ممکن ہے کہ مکمل صداقت کی منزل پر نہ پہونچے ہوں مگر لامحدودیت کے کنارے اپنے مقام سے انھوں نے بیش بہا اُلوہی نغموں کے مدہم سروں کو ضرور سنا ہوگا جسے وہ دہراتے رہے۔ ہم میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو اِن نغموں سے ایجابی طور پر ضرور متاثر ہوتے رہے ہیں۔

پروفیسر مجیب کے مطابق اقبال کے نظریۂ شخصیت میں آفاقیت کا عنصر شامل ہے مگر بالآخر اقبال کی فکر میں خودی اور انسانی برادری' مسلمان اور مسلمان قوم کے تصورات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں مسلمان اسی وقت حقیقی انفرادیت حاصل کر سکتا ہے جب وہ اپنی انا کو قوم کی نذر کرتا ہے۔ ویسے تو ہر انسان خدا کے سمندر میں ایک انمول ہیرے کا درجہ رکھتا ہے مگر مسلمان اسی وقت مسرت حاصل کر سکتا ہے جب وہ ایک قطرۂ آب کی طرح قوم کے سمندر کا حصہ نہ بن جائے۔ اسی لئے ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنی ''اجتماعی انا'' (کمیونل ایگو) کے فروغ کا تحفظ اور استحکام کے لئے سرگرم رہنا چاہئے۔

اقبالؔ کے فلسفے پر ایک یورپی نقاد ڈکن سن نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اگرچیکہ اقبالؔ کا فلسفہ آفاقی ہے مگر اس کا عملی اطلاق' اختصاصی نوعیت کا ہے۔ اس لحاظ سے صرف مسلمان ہی خدائی مملکت کے مستحق قرار پاتے ہیں جبکہ دوسرے فرقے یا تو ملت میں جذب ہو جائیں گے یا پھر ملت سے اخراج کا سامنا کریں گے''۔ اس اعتراض کے جواب میں اقبال نے لکھا کہ:

> ''شاعری اور فلسفہ میں انسانیت پرور عینیت پسندی ہمیشہ سے آفاقیت کی حامل رہی ہے۔ لیکن اگر آپ اس مقصد کو عملی طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو بہرحال زندگی میں کسی ایسے مخصوص معاشرے سے شروعات کرنی ہوگی جس کے اعتقادات اور خدوخال واضح طور پر متعین ہوں' اور جس میں گزرتے واقعات اور ترغیب کی بناء پر ہمیشہ توسیع کی گنجائش بھی موجود ہو۔ میرا یہ ایقان ہے کہ ایسا معاشرہ اسلام ہے.....
> صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام نوع انسانی خدائی مملکت کی مستحق ہے بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے اصنام کو خیرباد کہہ کر ایک دوسرے کا احترام کریں''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقبالؔ کی امیدوں اور آرزوؤں کا کیا مطلب تھا؟ کیا اقبالؔ مستقبل میں ایسا سماج بنانا چاہتے تھے جو ان کی آدرشوں پر مبنی ہو؟ یا پھر پروفیسر اسمتھ کے الفاظ میں ایک ایسا معاشرہ ان کے پیش نظر تھا جس میں حکومت ہند کی مردم شماری کے مطابق مسلمان محض اپنا وجود رکھتے ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں کی بابت اقبالؔ الجھن کا شکار تھے۔ اس لئے انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے اگر واقعی کوئی قدم اٹھانا ہو تو پھر اس کی ابتداء ہندوستانی مسلمانوں سے ہی ہونی چاہئے۔ قومیت کے نظریے سے ناپسندیدگی کے باوجود' اسلام کی وسیع تر برادری کی جگہ' اقبالؔ کی عملی توجہ اب ہندوستانی مسلمانوں پر مرکوز ہوگئی۔ اس طرح جس نئے مکان کی تعمیر اقبالؔ کرنا چاہتے تھے اس کا بنیادی پتھر بہرحال

قومیت ہی قرار پائی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ اور ان کے لئے کام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ انھیں ان میں ذہنی یگانگت نظر آئی۔ یہ ذہنی یگانگت خود اقبالؔ کے الفاظ میں سماجی روایتوں کے اشتراک یا لسانی ہم آہنگی یا نسلی و جغرافیائی تسلسل یا ہندو مسلم اتحاد سے کہیں زیادہ اندرونی (باطنی) اجتماعی ربط کی مظہر تھی۔ کافی غور و خوض کے بعد اقبالؔ نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود اس سلسلے میں اقبالؔ کے اس بیان کو بھی نہیں بھولنا چاہئے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ''صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی خدائی مملکت کی حق دار ہے''۔ اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے خوابوں کے نئے جہان میں بہر حال لچک ضرور موجود ہے۔ ان کے ان جذبات کی ترجمانی ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے جن کا تعلق ان کے شاعر اسلام کے دور سے ہے ؎

درویش خدا مست شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا دلّی نہ صفاہاں نہ سمر قند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
(بال جبریل سے)

اس نوع کے کچھ اور اشعار و خیالات کی مدد سے اقبالؔ کی مسلمانیت کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور عرب اسلام پر فخر کیا اور ان کی اس عقیدت میں، ہندوستانیت کبھی بھی حائل نہیں ہوئی۔ ان کے فرزند جاوید اقبال نے ایک واقعہ یوں بیان کیا کہ ایک دفعہ محفل میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے خواہش کی کہ حالیؔ کے مسدس سے پیغمبر اسلام کے بارے میں کچھ اشعار سناؤں۔ میں نے ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا''

مصرعہ پڑھا ہی تھا کہ دوسرے مصرعے کی قرأت سے پہلے والد محترم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جاوید اقبال نے مزید لکھا کہ ''وہ ہمیں تاریخ اسلام سے واقعات سناتے تھے..... ایک بار انھوں نے بتایا کہ نپولین کے آبا و اجداد عربی النسل تھے اور یہ کہ عربوں نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کے راستے بتلائے تھے''۔

۱۹۳۲ء میں وہ اسپین کے دورے پر تھے جس کو وہ مسلمانوں کے خون اور پسینے میں سینچی ہوئی ارض مقدس اور مسلم تہذیب کا خزانہ سمجھتے تھے۔ یہاں مسجد قرطبہ (جسے ۱۴۹۳ عیسوی میں کلیسا میں بدل دیا گیا تھا) پہونچے تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر بہہ رہے تھے اور یہاں انھوں نے خدا سے دعا مانگی اور مشہور زمانہ نظم ''مسجد قرطبہ'' لکھی جو اس تجربے کی یادگار ہے ؎

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات ! کار جہاں بے ثبات
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
اے حرمِ قرطبہ ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

جب وہ الحمراء کے قصر پہنچے تو پھر ان پر انسانی حرکیات کا موضوع چھا گیا۔ بعد میں انھوں نے لکھا کہ ''یہاں جس طرف بھی میں نے دیکھا ''ھوالغالب'' کی تحریر نظر آئی''۔ میں نے کہا کہ یہاں ہر طرف اللہ ہی چھایا ہوا ہے، کہیں نہ کہیں تو انسان کو بھی غالب ہونا چاہئے۔

مگر ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی نظم ''شکوہ''، جس کو پروفیسر اسمتھ' اقبال کی غیر معمولی تخلیق قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں شاعر نہ ہی جذباتیت اور نہ خود ادعائیت کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ وہ پریشان خاطر اور غصے میں بپھرا ہوا ہے۔ شاعر دنیا کی دوسری اقوام سے توحید کے معاملے میں مقابلہ کر کے خدا سے پوچھتا ہے کہ مسلمانوں کو خدا نے توحید پرستی کا آخر کیا صلہ دیا ؎

امتیں اور بھی ہیں' ان میں گنہ گار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں' مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں' غافل بھی ہیں' ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

ویسے تو وہ وسیع پیمانے پر یگانگت کے قائل تھے مگر اپنے جہان نو کی تعمیر کے لئے انھوں نے بہر حال ہندوستانی مسلمانوں کو ہی خشت اول کی طرح چن لیا۔ حالانکہ وہ ان کی صلاحیتوں سے مایوس اور ان سے بدظن بھی تھے۔ اپنی ایک تحریر میں انھوں نے لکھا بھی تھا کہ ''اپنے سیاسی زوال کے بعد ہندوستان میں مسلمان بڑی تیزی سے اخلاقی انحطاط کا شکار ہوئے ہیں۔ دنیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی اخلاقی گراوٹ سب سے زیادہ ہے''۔

حرکت و عمل کے محرک ہونے کے باوجود' اقبال مذہبی مصلح کا رول اختیار کرنے سے کتراتے رہے حالانکہ شیخ محمد اکرام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''کسی زمانے میں اقبال مسلمانوں کی بہتری کے لئے ہر قسم کی اصلاح کے زبردست موئید تھے''۔ مگر بعد میں اکرام نے اس مایوسی کا بھی اظہار کیا ہے کہ 'اقبال نے ناقابل اصلاح قسم کی قدامت پسندی کی بھی پوری طاقت سے وکالت کی''۔

محمد اکرام کے خیال میں اقبالؔ کے اس رویے کا تعلق دراصل اس جذباتی ماحول سے ہے جو اس وقت ہندوستان میں موجود تھا۔ جب اقبالؔ یورپ سے واپس آئے' ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت شبلی نعمانی' اکبرالہ آبادی اور ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھی جو ایک بدیسی اور غیر مسلم استبداد کی حکمرانی کے شدید مخالف تھے۔ اقبالؔ نے بھی اسی طرز فکر کو اپنایا جو کہ سرسید کے مکتب فکر سے بالکل مختلف تھی۔ اگرچیکہ اقبالؔ کا ذہن یورپ کی تعلیم و افکار سے متاثر تھا مگر وہ علی گڑھ طرز کی نئی تعلیم کی تائید میں نہیں تھے۔

یہ نئی شراب ذہن کو اور بھی کمزور کردے گی
یہ نئی روشنی تیرگی کو اور بھی بڑھادے گی

اکبرالہ آبادی نے سرسید اور ان کے مقلدوں کو اپنی شاعری میں طنز کا خوب نشانہ بنایا جس سے متاثر ہوکر اقبالؔ نے بھی اکبرالہ آبادی کی خدمت میں اپنا خراج تحسین یوں پیش کیا کہ ''میں ایک شاگرد کی طرح آپ کی آنکھوں میں روحانی رشد و ہدایت کی روشنی پاتا ہوں''۔ جیسا کہ اکرام نے بتایا پھر اقبالؔ بھی کھل کر اکبرالہ آبادی کی اتباع میں طنزیہ شاعری کرنے لگے۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ اور ترکی ایک دوسرے کے حریف تھے۔ آزاد اور اکبرالہ آبادی کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کی ہمدردیاں ترکی سے وابستہ تھیں۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ ترکی ایک مسلم ملک تھا بلکہ ترکی کا سلطان' سنی اسلام کا خلیفہ بھی تھا جس میں ہندوستانی مسلمان بھی شامل تھے اور وہ عربستان میں واقع مقامات مقدسہ کا نگران کار بھی تھا۔ جنگ کے بعد ترکی کے خلاف برطانیہ کے رویے سے بھی ہندوستانی مسلمان دل برداشتہ تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ایک نئے قانونِ صیانت یعنی رولٹ ایکٹ کے نافذ ہونے سے بھی ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں عام بے چینی پیدا ہو چلی تھی۔ گاندھی جی جو جنوبی افریقہ سے ۱۹۱۵ء میں لوٹے تھے' انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس پر جھپٹ پڑے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کریں۔ چنانچہ یہ تحریک چل پڑی اور ''خلافت تحریک'' کے دوران ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثالیں

سامنے آئیں۔ اقبالؔ بھی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کچھ عرصے کے لئے وہ بھی خلافت تحریک کی طرف متوجہ ہوئے اور گاندھی جی کی بھی تعریف کی۔ لیکن یہ تحریک انھیں زیادہ دیر تک متاثر نہ کرسکی۔

۱۹۲۲ء میں برٹش راج نے اقبالؔ کو سر کے لقب سے نوازا۔ یہ اعزاز ان کی شاعری کے اعتراف میں تھا۔ اقبالؔ نے عین خلافت تحریک کے دوران اس بدیسی اعزاز کو قبول کر کے علامتی طور پر ہندوستانی قومی تحریک سے اپنا رشتہ توڑ لیا جس کے خلاف کافی چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ ایک شاعر نے طنزاً کہا ؎

اللہ کے افضال سے 'سر' ہوگئے اقبال !

اقبالؔ خلافت تحریک کی سیاست سے تو علیٰحدہ ہوگئے مگر اس مذہبی قدامت سے خود کو الگ نہ کرسکے جو خلافت تحریک کے رہنماؤں کا اصل جذبہ تھی۔ بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنے عقیدوں اور گریزاں ضرورتوں کے تقاضوں کے درمیان بٹ سے گئے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں لکھے گئے ایک خط میں انھوں نے اپنے ایک دوست کو بتایا تھا۔

> ''میں نے انگریزی میں اجتہاد کے موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے جسے یہاں ایک محفل میں، میں نے سنایا بھی ہے۔ انشاءاللہ جلد اس کی اشاعت عمل میں آئے گی۔ اس پر بعض حضرات نے مجھے کفر کا فتویٰ بھی دے دیا ہے۔ اس موضوع پر آپ سے لاہور میں بالمشافہ گفتگو ہوگی۔ موجودہ حالات میں، خاص طور پر ہندوستان میں ان معاملات میں از حد احتیاط ضروری ہے''۔

وہ مضمون تو کبھی شائع نہ ہوسکا۔ ممکن ہے کہ ان ہی خیالات کا اظہار اقبالؔ نے اپنی کتاب ''اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید'' میں کیا ہو جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے اس کتاب میں واضح طور پر کہا تھا کہ ''موجودہ نسل کے آزاد خیال مسلم نوجوانوں کے اس حق کی

مدافعت کی جانی چاہئے کہ وہ بدلتے ماڈرن تقاضوں کے پیش نظر اساسی شرعی اصولوں کی تعبیر نو کرسکیں''۔

اقبالؔ کے ان الفاظ سے اصلاح پسندوں کو ضرور حوصلہ ملتا ہے جو آئے دن ان کو دہراتے رہتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اقبالؔ نے آزاد خیالی کے خطرات سے بھی لوگوں کو متنبہ کیا ہے۔ خلافت تحریک کے ختم ہوجانے کے بعد بھی ان کی محتاط روش باقی رہی۔ پروفیسر مجیب نے اقبالؔ کے اس رویے کو مختصراً یوں بیان کیا ہے کہ ''وہ یقیناً تبدیلی کے خواہاں تھے مگر وہ جرأت سے زیادہ احتیاط کے قائل تھے''۔ اسمتھ نے بھی اقبالؔ کے اس رجحان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ ''جہاں تک اُصول سازی کا سوال ہے اقبالؔ بہت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر جب کسی خاص موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو پھر وہ محتاط ہوجاتے ہیں۔ جیسے اسلامی اُصول و رواج یا خواتین کا موقف وغیرہ۔ وہ قانون یا شریعت کی پاسداری کی بات کرتے ہوئے جدید کاروں کی مذمت کرتے ہیں جو پوری طرح شریعت پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ مگر اقبالؔ کو محض محتاط قرار دینا بھی ان کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ جب وہ شریعت یا قانون کی بات کرتے ہیں تو وہ اپنے دماغ سے زیادہ دل کی بات کرتے ہیں۔

ہم نے قبل ازیں دیکھا کہ اقبالؔ اسلام کو ان تمام بدعتوں سے نجات دلانے کیلئے مضطرب تھے جو تصوف کی راہ سے در آئی تھیں۔ انھوں نے احمدیت کی بھی مخالفت کی جس میں غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کا دعویٰ پیش کیا تھا۔ چنانچہ وہ احمدیوں کو خارج از اسلام سمجھتے تھے اور جب خود ان کے بھائی عطا محمد نے احمدیت اختیار کی تو اقبال کی نظروں میں وہ بھی مسلمان نہیں رہے۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر راسخ العقیدہ اور شریعت کے قائل مسلمان' اقبالؔ کے پسندیدہ افراد میں شامل تھے چاہے انہیں ان کے عمیق افکار اور خیالات کا استحسان ہو یا نہ ہو۔ ایسے ہی افراد میں ایک نوجوان ادیب ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے۔ شاعر اقبالؔ نے مودودی کو پٹھان کوٹ منتقل ہونے کی ترغیب دی جہاں پر مستقبل کی جماعت اسلامی کے بانی کے لئے ایک

وسیع موقوفہ جائیداد' پرنٹنگ پریس کے ساتھ ان کی خدمات کیلئے موجود تھی۔ تقسیم ہند کے بعد مودودی پاکستان منتقل ہوگئے جہاں انھوں نے ایک نئی قوم کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کی تحریک چلائی' جس کو وہ جزوی طور پر نہیں بلکہ پوری طرح اسلام کے پروگراموں کے مطابق حکومت الٰہیہ کی صورت دینا چاہتے تھے۔

ایک امریکن محقق فری لینڈ اباٹ کے مطابق مودودی کے خیال میں ''تمام اسلامی ہیئتوں کو جوں کا توں نافذ کرنا ضروری ہے کیونکہ ہیئت بغیر روح کے بے معنی ہوجاتی ہے ..... کسی بھی ہیئت یا ظاہری رسم کا موجود ہونا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے وابستہ قدر کا وہاں وجود ہے''۔ یہ بات مشکل سے سہی اقبالؔ کے دل کی آواز ہوسکتی ہے کیونکہ شاعر تو انسان کی شخصیت کی تکمیل اس کی مکمل آزادی میں دیکھتا ہے اور جس کا یہ بھی خیال تھا کہ آزاد تخلیق ہی زندگی کا اُصول ہے۔ تاہم یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اقبالؔ نے مودودی کی ہمت افزائی کی۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اقبال بہت پرامید تھے کہ وہ ''اسلامی فقہ کی تدوین جدید'' پر اپنی کتاب مکمل کرلیں گے جس میں وہ ماڈرن دنیا کے بدلتے حالات میں شرعی قوانین کی تعبیرات کے امکانات پیش کرنے والے تھے۔ ان کی رحلت کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔

اگر آزاد خیال اور رجعت پسند حضرات اقبالؔ کے اشعار دہراتے رہتے ہیں تو ترقی پسند بھی ان کی شاعری کے مداح ہیں۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا کہ ''اگر بالشویزم میں خدا کا تصور ملا دیا جائے تو پھر یہ اسلام کے مماثل ہوجائے گا''۔ اپنی نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' انھوں نے غریبوں کے المیے پر بڑی شدت سے اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ اس کے فوری بعد کہی گئی ایک اور نظم میں خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو
(بال جبریل)

اشتراکیوں کے انکارِ خدا سے اقبالؔ مضطرب تھے مگر وہ اس کو روس کے قدامت پرست مشرقی کلیسا کی بدعنوانیوں کا ردعمل سمجھتے تھے ۔

یہ وحی دہریت ' روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

جمہوریت کے متوالوں کو بھی اقبالؔ کی شاعری اور ان کے ارشادات سے حوصلہ ملتا ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ انھوں نے لکھا کہ ''اسلام میں شخصی آمریت کا کھٹکا لگا رہتا ہے'' کیونکہ ان کے خیال میں ''معاشرے کے ہر رکن کی شخصی آزادی' مسلم دستور کا بنیادی اصول ہے'' اس کے باوجود اقبالؔ نے یہ بھی کہا کہ ۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے
(ضرب کلیم)

یا ان کا یہ ارشاد کہ دو سو گدھے مل کر بھی ایک انسان کے ایک خیال کی بھی برابری نہیں کر سکتے ۔

کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانی نمی آید
(پیام مشرق)

اب ہم اس موقف میں ہیں کہ اقبالؔ کے فلسفیانہ اور مذہبی افکار کا جائزہ لے سکیں۔ اگرچیکہ انھوں نے افکار میں بہت جرأت دکھائی مگر اکثر و بیشتر تردد کا شکار رہے۔ انھوں نے

بڑی بے باکی کا بھی مظاہرہ کیا مگر عملاً وہ محتاط ہی رہے۔ اگرچیکہ ان کے تخیل کی بلند پروازی ہمیں نئے جہانوں کی سیر کراتی ہے مگر پائمال راہوں پر وہ ہمارے ساتھ ہی ہم قدم نظر آتے ہیں۔ گوکہ ان کے پاس عالمی انسانی برادری کا تصور تھا مگر وہ ہندوستان کی مسلم قوم کے اندر ہی جذب ہو گئے اور کبھی کبھی تو بڑی بھیانک شدت کے ساتھ۔ اگرچیکہ ان کے نقوش قدم بہت گہرے اور توانا ہیں مگر وہ مختلف سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اقبالؔ کے قول و فعل میں بعد نظر آتا ہے۔ گو شیر و شاہین کو انھوں نے اپنی شاعری میں اونچا مقام دیا ہے مگر جیسا کہ ان کے فرزند جاوید اقبال بتلاتے ہیں وہ خون دیکھنے کی ہمت سے قاصر تھے اگرچیکہ انھوں نے اپنی نظموں میں عمل کی تلقین کی مگر وہ خود اتنے تساہل پسند تھے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے گھر کے صحن میں چہل قدمی کرتے تھے۔ جیسا کہ جاوید بتلاتے ہیں کہ :

> ''انھیں گھر کے باہر جانا قطعی ناپسند تھا۔ گھر میں صوفے پر بیٹھنا یا بستر پر نیم دراز ہو کر لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا..... سر شام ان کے دوست اور مداح جمع ہو جاتے۔ ان کے بستر کے اطراف کرسیاں جمادی جاتیں اور وہ حقے کا کش لیتے ہوئے ان سب سے گفتگو میں محو ہو جاتے''۔

اگرچیکہ نھوں نے عشق کی خوب مدح سرائی کی مگر کبھی بھی کسی بچے کو پیار نہیں کیا۔ اسلام ان کا عقیدہ تھا اور مسلمان قوم ان کی دنیا تھی مگر ان کے دو بہترین دوست سکھ تھے' سر جگندر سنگھ اور امراؤ سنگھ۔ وہ اتنے وسیع المشرب تھے کہ ایک بار انھوں نے ایک ہندو کو مایوسی کی گہراؤں سے نکال کر اسے خودکشی کے المیے سے بچایا تھا۔

وہ ہرگز حریص نہیں تھے مگر کبھی بھی کشادہ دست نہیں رہے۔ ہمیشہ انھیں روپے پیسوں کی ضرورت رہتی۔ اگرچیکہ وکالت ہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھی مگر عام طور پر وہ مقدمات قبول کرنے سے کتراتے تھے کہ کہیں یہ پیشہ ورانہ مصروفیت ان کی دوست نوازی اور شاعری میں

حائل نہ ہو۔ اپنے فرزند جاوید میں مصوری کے ذوق کو فروغ دینے کیلئے وہ مشہور یورپی فنکاروں کی تصویروں کی نقول خرید کر دیتے تھے۔ مگر جب جاوید نے ان سے یورپ کے سفر کے دوران خط لکھ کر گراموفون لانے کی خواہش کی تو انھوں نے بیٹے کو مشین کی آواز کے بجائے ''سکوت لالہ وگل سے'' کلام سیکھنے کی نصیحت کی ۔

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں غریبی ہے
خودی نہ بیچ ' غریبی میں نام پیدا کر
(جاوید کے نام۔ بال جبریل)

وہ بہ ظاہر تصوف کے مخالف مگر دل سے ایک عارف تھے۔ بسا اوقات اولیاء کے بارے میں رومی کے اشعار پڑھتے ہوئے یا سنتے ہوئے وہ کچھ اتنے متاثر ہو جاتے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ ان کے ایک مداح نے ان کا ایک شعر پڑھا ۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

اور ان سے پوچھا کہ یہ شعر آپ کے یورپ کے سفر کے دوران لاہور یا سیالکوٹ کی ناسٹلجیا (Nostalgia) کی تو غمازی نہیں کرتا؟ اس پر انھوں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اس میں زمین پر دنیا آباد ہونے سے پہلے دراصل عدم آباد کے حوالے سے بات کہی گئی ہے!

اقبالؔ کے طالب علم جانتے ہیں کہ شاعر پر وقفہ وقفہ سے غم کے دورے پڑتے تھے۔ ان کی ایک سوانح نگار' رہبر نے لکھا کہ ''ان کی روح غم کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی''۔ ان کی ذات میں چھپا ماورائی غم ان کی گفتگو کی خوش بیانی کے دوران مقناطیسی قسم کی ڈرامائی کشش فراہم کرتا تھا جس کی وجہ سے لوگ ان کی شخصیت کے اطراف کھنچے کھنچے چلے آتے تھے۔ ہم نے

اس سے پہلے اشارہ کیا تھا کہ کس طرح انھوں نے فرنگ کی مئے میں کیفِ غم کے نہ ہونے کی شکایت کی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت کبھی بھی غم سے عاری نہیں رہی۔ غم کی یہ کیفیت قرآن، حدیث یا پھر کسی پُر اثر شعر کی قرأت سے یکلخت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ اپنے احباب کو ایک روایت سنا رہے تھے کہ کس طرح صحابہ کرام ان آہوؤں سے رشک کرنے لگتے تھے جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کی تھی۔ یہ روایت سناتے سناتے وہ یکلخت گنگ ہو گئے اور ان کی آواز کانپنے لگی۔ پھر انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سنائے کہ ''اللہ کے سوائے کسی کے آگے سر نہ جھکاؤ' جہاں تک تمہارے بزرگوں کا سوال ہے تم ان کی تعظیم کرو'' پھر انھوں نے کہا کہ ''ساری دنیا کے ادب میں اس سے بہتر کوئی جملہ نہیں ہے''۔ جیسا کہ رہبر نے بتایا کہ اقبال کی شخصیت خداداد صلاحیتوں کی حامل تھی جن میں ان کی پُرکشش وجاہت، حسِ مزاح اور ذہین گفتگو شامل تھی۔ جس طرح فولاد، پتھر اور گچ کی آمیزش سے ایک مضبوط ڈیم کھڑا رہتا ہے ویسے ہی ان عناصر کی آمیزش نے بھی ان کی شخصیت کو وہ صلابت عطا کی تھی کہ وہ آنسوؤں کے سیلاب کو ہمیشہ تھامے رہتے تھے..... لیکن کبھی کبھی جب یہ باندھ ٹوٹ جاتا تھا تو پھر ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

انتقال سے پہلے انھوں نے لکھا کہ ''عشق کے اعلان کی جگہ منبر نہیں بلکہ دار ہے'' یہ جملہ انھوں نے نویں صدی عیسوی کے صوفی حلاج کی بابت کہا، جنھیں اس وقت کی حکومت نے ان کو متنازعہ فی خیالات کی وجہ دار پر لٹکا دیا تھا۔ حلاج کو مشرک گردانتے ہوئے اقبالؔ نے بھی ان کا رد کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں ان کے خیالات کی فلسفہ خودی کی روشنی میں تعبیر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو حلاج سے منسوب کر لیا۔ چنانچہ ان کی شاہ کار طویل مثنوی ''جاوید نامہ'' میں حلاج، اقبالؔ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ؎

تھی مرے سینے کے اندر بانگ صُور
ایک ملت کر رہی تھی قصد گور
ہو گئے تھے خود سے منکر کلمہ گو

آگئی تھی کافروں کی ان میں خو
'امر حق' کو نقش باطل کہہ دیا
کیونکہ ہے وہ آب اور گل میں رچا
میں نے روشن خود میں کی نار حیات
کہہ دیئے مردے سے اسرارِ حیات
طرحِ نو رکھتے ہیں بافیض خودی
قاہری میں گھولتے ہیں دل بری
ہر کہیں پیدا خودی، پنہاں خودی
کب ہے اپنی آنکھ پر عریاں خودی

(جاوید نامہ۔ترجمہ م م)

کیمبرج یونیورسٹی کے ایک ساتھی رینالڈ نکلسن نے خط لکھ کر جب اقبال سے ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تو اقبال کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔ان کے ایک دوست جو وہاں موجود تھے' انھوں نے اقبال سے پوچھا کہ ''آپ اتنا کیوں متاثر ہو گئے؟'' شاعر نے جواب دیا کہ ''میرے اپنے لوگ جن کی خودی کو میں استوار کرنا چاہتا ہوں' ان لوگوں نے نہ ہی میری کتاب کو سمجھا اور نہ ہی اس کی قدر کی جبکہ فرنگی اس کتاب کو سمجھنا چاہتے ہیں جو میرے پیغام کے مخاطب بھی نہیں ہیں''۔ جیسا کہ ان کے فرزند جاوید نے بیان کیا کہ غم ناکی ان کے مزاج میں اتنی سرایت کر گئی تھی کہ وہ بسا اوقات بلا وجہ بھی رو پڑتے تھے۔ بعد میں یہ گلہ بھی کرنے لگے تھے کہ ''نہ کوئی مجھ سے ملتا ہے اور نہ ہی کوئی میرے پاس بیٹھنا چاہتا ہے''۔

درحقیقت وہ بہت کم تنہا رہتے تھے۔لوگ ان کی گفتگو سے مستفید ہونے کے لئے ان کے در پر حاضری دیتے۔ وہ سیدھے سادے کپڑوں میں ملبوس صبح سے شام تک تکیہ سے لگے

بیٹھے رہتے یا پھر آرام کرسی پر دراز رہتے جبکہ ملاقاتیوں کا کمرے میں تانتا سا لگا رہتا۔ کسی کی بھی حاضری یا گفتگو سے نہ ہی ان کے چہرے پر بوریت دیکھی جاتی اور نہ ہی وہ کبھی بوجھل نظر آتے۔ چاق و چوبند اور چست گفتگو کے دوران وہ کسی کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتے یا ان کی معصومانہ شرارت کی وجہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے قہقہوں سے کمرہ گونجتا رہتا۔ پنجابی زبان یا پھر پنجابی لہجے میں اردو میں کی گئی ان باتوں کا موضوع زیادہ تر مذہب ہی ہوتا۔ رہبر نے ان محفلوں کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:

> ان کے سلام لینے کے انداز سے بظاہر سرد مہری جھلکتی تھی۔ وہ دایاں ہاتھ اٹھا کر بڑی لاپرواہی سے چھوڑ دیتے تھے مگر فوراً ہی ان کے چہرے پر حرارت اور چمک ظاہر ہوتی۔ جب ان کی طبعیت کسی موضوع پر گفتگو کے لئے راغب ہوتی تو ''ہاں'' کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کرتے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی حاضرین آواز برگوش ان کی گفتگو کے لامتناہی امکانات کے منتظر اور مشتاق ہو جاتے ..... خاموشی کے وقفوں کے دوران بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کبھی ''یا اللہ'' بھی کہتے .....عموماً ان کی آنکھیں ادھ کھلی رہتیں مگر جیسے جیسے دلچسپی میں اضافہ ہوتا.....آنکھیں پوری طرح کھل جاتیں۔
>
> رہبر لکھتے ہیں کہ ''ملاقاتیوں کے تسلسل سے اقبال دل سے اپنے مداحوں کے مشکور تھے کیونکہ گفتگو کے ماہر فن کار کو اپنے فن کے مظاہرے کیلئے سامعین مل جاتے تھے''۔

بعض وقت بات چیت کا اہتمام ان کے دوست مرزا جلال الدین کے گھر بھی کیا جاتا۔ جہاں ان کے دیرینہ یار جگندر سنگھ اور امراؤ سنگھ بھی موجود رہتے۔ ایسی محفلوں میں گانے بجانے کا بھی اہتمام کیا جاتا جہاں دوستوں کے درمیان بذلہ سنجی کا بھی تبادلہ ہوتا۔ کبھی کبھی موسیقی ریز ماحول سے اقبال کو تحریک ملتی اور وہ سخن وری کی طرف مائل ہو جاتے۔ ایسے میں موسیقار، موسیقی کو مدھم کر دیتے تاکہ شاعر کے موڈ سے ماحول کو ہم آہنگ کیا جائے۔

شاعر کے لئے سخن وری کی تحریک کبھی گھر کے ماحول میں بھی ہو جاتی جہاں خاندان کے بڑوں کے ساتھ بچے بھی خاموشی اختیار کر لیتے۔ کبھی کبھی یہ کیفیت آدھی رات کے وقت بھی پیدا ہو جاتی۔ جاوید ایک واقعہ کو یوں یاد کرتے ہیں:

جب ان پر سخن وری کی کیفیت طاری ہوتی تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی جسمانی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ کبھی رات کے آخری لمحوں میں وہ اپنے ملازم علی بخش کو دستک دے کر بلاتے کہ وہ ان کے لئے کاغذ اور قلم لے آئے۔ جیسے جیسے وہ نوٹ بک میں شعر لکھتے جاتے ان کا چہرہ بحال ہوتا جاتا۔ ایسا لگتا جیسے انھیں کسی کرب سے نجات ملی ہو۔

اونچی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے اقبالؔ ہمہ قومی اسلامی برادری کے گیت گاتے رہے لیکن ان کے پاؤں تو پنجاب کی مٹی میں جمے ہوئے تھے جس نے بہر حال انھیں ایک دن سیاست میں ڈھکیل دیا۔ ''آپ کے اعزاز و اکرام کو اب' آپ کے افکار و خیالات کی عمل آوری کے لئے استعمال کرنا چاہئے'' ان کے دوستوں نے انہیں مجبور کر دیا۔ اس طرح وہ صاحب فکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی رہنما کی حیثیت بھی اختیار کر گئے۔ 1926ء کے انتخابات میں انھوں نے مشکل سے ہی اپنے ہاتھ پیر ہلائے ہوں اور گھر بیٹھے ہی انھیں پنجاب کی قانون ساز کونسل کی مسلم نشست کے لئے چن لیا گیا۔ تین سال بعد انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ایک نہایت معنی خیز خطبہ دیا جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے ۔۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں لندن میں بلائی گئی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں انھوں نے حصہ لیا جس میں ہندوستان میں سیاسی اصلاحات پر بحث کی گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں اقبالؔ اپنے سارے خاندان کے ساتھ اس مکان میں منتقل ہوئے جسے انھوں نے پہلی بار خریدا تھا۔ منتقل ہونے کے دو دن بعد ہی ان کی اہلیہ سردار بیگم انتقال کر گئیں۔ جاوید اس دردناک منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہم دونوں (جاوید ۱۱ سال' منیرہ ۵ سال) پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہم اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ بستر پر دراز تھے کہ ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ ان کی آواز بھی بیٹھ گئی تھی اور وہ کھل کر بات

نہیں کر سکتے تھے میں اور منیرہ دروازے پر کھڑے تھے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ انھوں نے ہم کو دیکھا اور قریب آنے کو کہا۔ جب ہم ان کے قریب گئے ہم کو دائیں اور بائیں بیٹھنے کو کہا۔ پھر بڑے پیار سے ہمارے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے کسی قدر درشت لہجے میں کہا کہ ''تم کو اس طرح رونا نہیں چاہئے۔ یہ یاد رکھو کہ تم مرد ہو اور مرد آنسو نہیں بہاتے''۔ اس کے بعد انھوں نے ہم دونوں کے ماتھے کو چوما۔ شاید زندگی میں پہلی بار''۔

۱۹۳۰ء کے ختم تک اقبالؔ نے ایک ایسی بے جوڑ توقع کا اظہار کیا جس نے ہر ایک کو حیرت میں ڈال دیا۔ مگر جس کی تکمیل ہندوستان کا مقدر بن چکی تھی۔ اس سال لکھنو میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنائی جائے ..... شمال مغربی ہندوستان میں ایسی ہندوستانی مسلم ریاست کی تشکیل کم سے کم شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی بالآخر ایک منزل ہوگی۔

اس توقع یا آرزو کا آخر کیا پس منظر تھا؟ بظاہر ۱۹۲۷ء کا ہندوستانی سیاست کا منظر نامہ بجائے خود ایک وجہ ہو سکتی ہے جب انھوں نے کہا تھا کہ:

مجھے متحدہ قومیت کی بات بے سود معلوم ہوتی ہے۔ اس ملک کے شہریوں کے لبوں پر یہ اصطلاح گزشتہ ۵۰ سال سے موجود ہے۔ ایک مرغی کی طرح یہ بہت کچھ کڑکڑاتی رہی ہے مگر ابھی تک اس نے ایک بھی انڈہ نہیں دیا..... اس ملک میں ہمیشہ سے ایک فرقہ دوسرے فرقے کو تباہ کرنے کے درپے رہا ہے۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ قوی ان کے ذہن میں یہ تصور رہا کہ ہم عقیدہ لوگوں کی مسلم ریاست کی شروعات سے شاید وہ عالمی برادری کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کے پارہ پارہ ہونے کے بعد وہ یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ دنیا میں اب ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلام کا پرچم لہرانا چاہئے۔ اس سے قبل ۱۹۳۰ء کے اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''ان کی آبادی'' ایشیاء کے سارے مسلمانوں کی جملہ آبادی سے زیادہ ہے اور یہ کہ ان کو اس حقیقت کو بھی سمجھنا چاہئے کہ وہ عصری اسلام کا سب سے بڑا اثاثہ ہیں''۔ ایک پاکستانی اسکالر رفعت حسین کا خیال ہے کہ اقبالؔ ''ایک نئی مسلم ریاست کے قیام کے ذریعہ اخوت سے منسوب لوگوں کے لئے آفاقی برادری کے خواب کی عملی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے''۔

اس تناظر میں دیکھیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے اقبالؔ کا زور اس کام کی شروعات یا پہل سے تھا نہ کہ ہندوستان سے علیٰحدگی پر۔ وہ ایک مستحکم مسلم ریاست کے قیام میں عملی افادیت دیکھ رہے تھے اگرچیکہ ان کا بنیادی محرک عینیت پرستی پر مبنی تھا۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ کیا ایسی ریاست کے شہریوں میں یہ صلاحیت یا اہلیت تھی کہ وہ اقبال کی آرزوؤں کی تکمیل کرسکیں۔ ممکن ہے کہ ہم اقبالؔ پر ضرورت سے زیادہ عینیت پرستی کا الزام بھی عائد کریں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے کبھی بھی ہندوؤں کے خلاف نفرت کی بات نہیں کی۔

ہمیں ڈاکٹر اقبال کے لکھنو کے خطبے کے اس فقرے کو یاد رکھنا چاہئے جس میں انھوں نے ''ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہندوستان'' کی بات کہی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہندوستان سے تمام رشتے توڑ لینا چاہتے تھے۔ بہ ظاہر وہ اس پر راضی تھے کہ انھیں ایک اعلیٰ درجہ کا ''فرقہ پرور'' سمجھا جائے جو تنگ نظر فرقہ پرستی کی جگہ ہر فرقہ یا گروپ کی آزادانہ ترقی کا قائل ہو۔ اقبالؔ نے بعد میں یہ بھی اعلان کیا کہ ''میں دوسرے فرقوں کے رسوم ورواج' قوانین ان کے سماجی و مذہبی اداروں کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ بلکہ قرآن کی تعلیمات کی

روشنی میں اگر ضرورت پڑے تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں ان کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کروں''۔

یہ نئی ریاست' ایک مسلم ریاست ہوگی' یہاں ایسی مذہبی حکومت ہوگی جس میں ہندوؤں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اقبال کی مجوزہ اسکیم میں دو قابل غور نکتے تھے۔ ایک تو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ مشرقی پنجاب کے ہندو اکثریتی اضلاع کو اس اسکیم سے خارج کرنے کے لئے راضی تھے جسے بعد میں جناح نے قبول نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ شمال مشرق میں واقع مسلم اکثریتی علاقے' اقبال کی اس اسکیم میں شامل نہیں تھے۔ اقبال واضح طور پر غالب مسلم اکثریتی علاقوں میں اپنے نظریات اور اصولوں کے پنپنے کے امکانات دیکھ رہے تھے۔ بعد کے دنوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جناح کا زور نظریاتی بنیادوں سے زیادہ غیر مسلم (ہندوؤں) کی آبادی سے مساوات جتانے پر تھا۔ یقیناً جناح نے پاکستان حاصل کرنے میں تاریخی رول ادا کیا مگر مسلمانوں کے لئے ان کا ایک علیٰحدہ وطن کا نظریہ اقبال کی طرح غیر مشروط نہ تھا۔

جناح نے ۱۹۱۶ء میں لکھنو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک معاہدے کی تکمیل میں نمایاں رول ادا کیا تھا جس کی رو سے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو علیٰحدہ حق رائے دہی دیا گیا تھا اور پنجاب کے صوبے میں ہندوؤں اور سکھوں کی اقلیت کو ان کی آبادی کی بنیاد پر متناسب نمائندگی دی گئی تھی۔ اقبال نے مسلمانوں کے لئے علیٰحدہ حق رائے دہی کا استقبال کیا مگر پنجاب میں ان کے اثر و نفوذ کی کمی کی مخالفت کی۔ ۱۹۲۰ء کے دہے کے آخری سالوں میں جناح نے کانگریس اور لیگ کے درمیان مناقشے کے تصفیے کے لئے کئی تجاویز پیش کیں جس میں علیٰحدہ حق رائے دہی سے دستبرداری کے عوض' سیاست میں مسلمانوں کو کل ہند پیمانے پر متناسب نمائندگی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ کانگریس نے جناح کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اقبال بھی اس تجویز سے متفق نہیں تھے۔ بعد میں اقبال نے دو قومی نظریے کے تحت ہندو۔ مسلم مشترک حق رائے دہی کو بھی رد کر دیا۔

۱۹۳۷ ۔ ۱۹۳۶ء کے دوران اقبال اور جناح کے درمیان کئی خطوط کا تبادلہ ہوا۔ اقبالؔ نے جناح کے نام جو خطوط لکھے وہ تو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے لیکن جناح کے اقبالؔ کو لکھے گئے خطوط ابھی تک دستیاب نہیں ہیں۔ اس خط و کتابت کا تعلق کانگریس کے صدر جواہر لال نہرو کے اس اعلان پر تھا جس کے تحت کانگریس بڑی سرگرمی سے مسلمانوں سے عوامی ربط پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ نہرو کے سوشلسٹ افکار کی ان کے درمیان ترویج ہو سکے۔ انھیں یقین تھا کہ جواہر لال نہرو کے لادینی سوشلزم کی مسلمانوں میں پذیرائی کی توقع کم ہے۔ اس کے باوجود اقبالؔ نے اس اقدام کا جواب دینے کی تجویز پیش کی۔ ان کے خیال میں نہرو کو اس کا سب سے موثر جواب یہ ہو سکتا تھا کہ جناح مسلم ریاستوں کے وفاق کی تشکیل کا اعلان کر دیں اور خود مسلمانوں اور مسلم لیگ کا مقصد بھی یہی تھا۔

''کیوں نہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کے حق خود اختیاری کے تحت اپنی اپنی ریاستیں بنانے پر غور کیا جائے؟'' اقبالؔ شمال مغرب کے ساتھ بنگال کو بھی علیٰحدہ مسلم قومیت سمجھنے لگے تھے۔ اپنے خطوط میں اقبالؔ نے اسلامی سوشلزم کی وکالت کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اسلامی شریعت روزگار کی فراہمی کو بھی واجب قرار دیتی ہے۔ لیکن شریعت کے مکمل نفاذ کے لئے ایک مقتدر مسلم ریاست کا وجود ضروری ہے۔ ایسی ریاست کو چاہئے کہ وہ ماڈرن افکار اور خیالات کی روشنی میں ایک اسلامی لائحہ عمل تیار کرے۔ بالآخر اقبالؔ نے جناح سے کہا کہ وہ مسلم لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس کسی مسلم اقلیتی صوبے کی بجائے لاہور میں منعقد کریں جس کو سردست نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

ابھی حالات تقسیم کے لئے سازگار نہیں تھے۔ اس لئے جناح نے اقبالؔ کی تجاویز کو قبول نہیں کیا۔ جناح نے مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کے لئے لکھنو کا انتخاب کیا جو کہ مسلم اقلیتی ریاست کا صدر مقام تھا۔ اسی دوران ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے وزراء نے منتخب ہو کر ہندو اکثریتی صوبوں میں اقتدار سنبھال لیا۔ اب مسلم لیگ کے ''ہندو راج'' کے اندیشے پورے ہوتے ہوئے نظر آئے۔ صحیح یا غلط ان اندیشوں نے بہر حال جناح کو ایک ایسا موقع فراہم کر دیا

جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ بے حد پُرعزم تھے۔

جناح کے لئے ایک قابل غور امر یونینیسٹ (UNIONIST) پارٹی کی طاقت تھی جس کے لیڈر سر سکندر حیات خاں پنجاب کی وزارت عظمٰی کے عہدے پر فائز تھے اور جسے پنجاب کے تمام متمول مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ جناح' سکندر حیات کو خوش کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے جبکہ اقبالؔ کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ غریب عوام کی تائید سے یونینسٹ پارٹی کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر ۱۹۴۰ء میں لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کیا اور علیٰحدہ مسلم ریاست یا ریاستوں کی تشکیل کے لئے ایک قرارداد پاس کی۔ اس وقت تک اقبالؔ کی رحلت ہو چکی تھی۔ جناح نے لاہور کے صدارتی خطبے میں نہ ہی اقبالؔ کا ذکر کیا اور نہ ہی ان کی مجوزہ اسکیم کا حوالہ دیا۔

نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں اقبالؔ کی وفات سے کچھ ماہ پہلے کی اپنی ایک ملاقات کے حوالے سے لکھا کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ'' آپ میں اور جناح میں کیا فرق ہے؟'' پھر خود ہی جواب دیا کہ'' جناح ایک سیاست داں ہیں اور آپ ایک محبّ وطن''۔ ایک برطانوی مصنف ایڈورڈ تھامسن نے اقبالؔ سے اپنی گفتگو کے حوالے سے لکھا کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ علیٰحدہ ریاست کے قیام کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرنے لگے تھے جس کا ان دنوں بہت چرچا تھا۔ ان باتوں سے ہم کیا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں؟ اس بات کی تو توثیق ہوتی ہے کہ اقبالؔ اور جناح کے تعلقات ہمیشہ ہموار نہیں تھے اور یہ کہ بننے والے پاکستان کے بارے میں دونوں کے نظریات مختلف تھے۔ اس کے باوجود ان امور سے نہ ہی اقبالؔ کے مسلمانوں کے لئے علیٰحدہ ریاست کے قیام کے جذبے کی تنسیخ ہوتی ہے اور نہ ہی جناح سے ان کے روابط میں کمی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ۱۹۳۷ء میں اقبالؔ نے جناح کو ایک خط میں لکھا تھا کہ آپ واحد ایک ایسے رہنما ہیں جو ہندی مسلمانوں کو منزل مقصود تک پہنچا سکتے ہیں اور بعد میں خود جناح نے بھی اقبالؔ کے بارے میں کہا تھا کہ'' وہ ایک چٹان کی طرح مضبوط'' انسان ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سکندر حیات اور اقبالؔ کے درمیان روابط میں سرد مہری تھی۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں جب ''یوم اقبال'' منایا جانے والا تھا تو پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے سکندر حیات نے اقبال کی گرتی ہوئی صحت اور جز معاشی کی وجہ عوام سے اپیل کی کہ:

> برسہا برس کی خواب غفلت کے بعد ہم اقبالؔ کے پیام کی وجہ سے بیدار ہوئے ہیں۔اس لئے ان کے اعزاز میں جہاں جہاں یوم اقبال منایا جارہا ہے میری تجویز ہے کہ وہاں عوام عطائے جمع کریں تا کہ ہم شاعر کی خدمت میں ایک نذرانہ پیش کرسکیں''۔

اپنے سیاسی رقیب کی اس ''عنایت'' کے اظہار کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے اقبال نے کہا ''اگر چیکہ لوگ میرے کام سے متاثر ہوئے ہیں اور انھیں مجھ سے حوصلہ بھی ملا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک شخص کی نجی ضرورتوں سے کہیں زیادہ اہم عوام کی ضروریات ہیں''۔اگر عوام واقعی انھیں اعزاز سے نوازنا چاہتے ہیں تو اقبالؔ نے کہا کہ ''کسی کالج میں عصری خطوط پر اسلام کی تحقیق کے لئے نشست (چیر) قائم کی جائے''۔وزیر اعظم سے اس تجویز کی منظوری کی توقع کا اظہار کرتے ہوئے خود اقبالؔ نے اپنی طرف سے ایک سو روپیہ کا عطیہ پیش کیا۔

اگر چہ کہ اقبالؔ نے پنجاب کی سیاست میں بڑی سنجیدگی سے حصہ لیا اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں لندن کی کانفرنس میں بھی سرگرم حصہ لیا مگر درحقیقت وہ سیاست داں سے زیادہ ایک تصور پرست (وژنری) انسان تھے۔ان کا تصور (وژن) ایک شاعر کا وژن تھا ۔وہ خدا' انسان اور دنیا کے بارے میں بڑی شدت سے سوچتے تھے۔ان کا یہ سروکار بھی شاعرانہ سروکار تھا۔ہادی حسن کے الفاظ میں اقبالؔ کا ''خدا خود ایک اولین شاعر اور اعلیٰ ترین تخلیقی فن کار ہے جو خود کو آشکار کرنے کے زبردست جذبے کے تحت مسلسل اپنی خلاقی کا اظہار

کر رہا ہے''۔

چنانچہ ہادی حسن کے مطابق اقبالؔ کا مثالی انسان:

> خدا کا مددگار اور کار آموز ہے جو اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے اپنے مالک کی خلاقیت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے اور بہتر سے بہتر اختراع میں مصروف ہے .....اس کی کائنات ایک ایسی نظم ہے جسے ابھی لکھا جانا باقی ہے اور جسے خدا اور انسان مل کر لکھنے میں مصروف ہیں۔

محمد اقبالؔ اس صدی (بیسویں صدی) کے عظیم شعراء میں سے ایک ہیں۔ان کی شاعری کا مرکزی کردار نہ ہی فطرت ہے اور نہ ہی کوئی خوبصورت محبوبہ بلکہ حرکت و عمل کا پیکر انسان ہے ۔

ہماری کوئی منزل نہیں
بس بے تکان ایک جاوداں سفر ہے
افلاک کی بلندیوں سے سمندروں کی گہرائیوں تک
زماں اور مکاں دونوں ہی
ہمارے راستے کی گرد سفر ہیں (آزاد ترجمہ)

بعض شاعروں اور بندگانِ خدا کے لئے آدمی بس ایک خاک کا پتلا ہے مگر اقبالؔ کا انسان نقرئی غازے سے مزین قابل فخر انسان ہے جیسا کہ خود اقبالؔ تھے۔ جب افغانستان کے بادشاہ سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ''اچھا آپ اقبالؔ ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ آپ کے چہرے پر ڈاڑھی ہوگی''۔اقبال نے ترکی بہ ترکی جواب دیا'' میری حیرت آپ سے زیادہ ہے۔آپ ایک فوجی جنرل ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ دیو قامت شخصیت کے مالک ہوں گے مگر آپ تو دبلے پتلے لاغر انسان ہیں''۔

جب وہ اپنی پسند کی صحبت میں ہوتے تو بڑے پُرسکون انداز میں زندگی کے بارے میں ہنستے بولتے رہتے۔ ایک بار رمضان کے مہینے میں افطار سے قبل دو دوست ان سے ملنے آئے۔ اقبالؔ نے اپنے ملازم رحیما سے کہا ''بھئی ان کے لئے کھجور، سنترے، مٹھائی اور کھارا لے آؤ''۔ مولانا سالک جوان کے ساتھ آئے تھے، انھوں نے کہا کہ ''آپ تکلف نہ کریں۔ ہمارے لئے بس دو کھجور کافی ہیں''۔ ''ٹھیک ہے''۔ اقبال نے جواب دیا ''مگر مجھے آپ کو میری تکلفات کی لمبی فہرست سے مرعوب کرنے کا موقع تو دو''۔

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آفاقیت کے حامل اقبال نے آل انڈیا ریڈیو لاہور سے ایک تقریر نشر کی۔

> دنیا میں صرف ایک ہی اتحاد قابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہے انسانی برادری کا اتحاد جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان ..... سے بلند تر ہے۔ جب تک لوگ اپنے عمل سے اس یقین کا اظہار نہ کریں گے کہ پوری دنیا خدا کا ایک خاندان ہے..... آزادی، مساوات اور برادری جیسے خوبصورت اقدار کا حصول ناممکن ہے۔

دمہ کے مرض سے اقبالؔ علیل تھے۔ ۲۰/اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے ایک مداح کی فرمائش پر انھوں نے ایک قطعہ پڑھا جو انھوں نے حال ہی میں لکھا تھا ؎

سرود رفتہ پھر آئے نہ آئے — کہ پھر بادِ حجاز آئے نہ آئے
اب آپہنچا ہے میرا وقتِ آخر — کوئی دانائے راز آئے نہ آئے

(ارمغان حجاز سے۔ ترجمہ م م)

یہ قطعہ پڑھنے کے چند گھنٹوں بعد جاوید اپنے والد سے ملنے گئے مگر اقبالؔ اس قدر بیمار تھے کہ اپنے ۱۴ سالہ بیٹے کو پہچان بھی نہ سکے۔ ''آپ کون ہیں؟'' شاعر نے سوال کیا۔ ''میں جاوید ہوں'' بیٹے نے جواب دیا۔ اقبالؔ مسکرائے اور اپنے دوست سے مخاطب ہو کر کہا ''چودھری صاحب (چودھری محمد حسین) اسے جاوید نامے کے خاتمے پر لکھی نظم ''جاوید سے

خطاب ''ضرور پڑھایئے'' کچھ دیر بعد اقبالؔ کی روح پرواز کر گئی۔
پدرانہ جذبات اور مشفقانہ نصیحت سے مملو اس نظم کا کچھ حصہ یہاں پیش ہے۔

ہاں مگر صاحب نظر تو ہے اگر
آنے والے دور پر بھی کر نظر

عقل ہے بے باک ' دل ہیں بے گداز
آنکھ بے شرم اور تماشائے مجاز

علم و فن ' دین و سیاست ' عقل و دل
زوج زوج اندر طوافِ آب و گل

آدمیت ' آدمی کا احترام
جان لے ! کیا آدمی کا ہے مقام

ربط و ضبط تن بہ تن سے آدمی
گام زن ہوجا بہ راہ دوستی

عشق کا بندہ چلے حق کا طریق
کافر و مومن ہو دونوں پر شفیق

کفر و دیں ہوں زینت پنہائے دل
دل سے دل بھاگے اگر تو وائے دل

ہے اگرچہ دل ' اسیر آب و گل
یہ سبھی آفاق ہے آفاقِ دل

(جاوید نامہ سے۔ترجمہ م م)

☺☺☺☺☺

کتابیات

1. Ikram, Shaik Muhammed
Modern Muslim India & Birth of Pakistan, Lahore.

2. Iqbal, Javed (ed) : Notebook of Allama Iqbal, Lahore (1961)

3. Malik, Hafeez (ed) : Iqbal : Poet-Philosopher of Pakistan, Columbia, New York (1971)

4. Mujeeb, Mohd : The Indian Muslims, George Allen & Unwin, London (1974)

5. Nasr, S.H. : Ideas & Realities of Islam, Allen & Unwin, London (1975)

6. Rahman, Fazlur : Islam, University of Chicago Press, Chicago (1979)

IQBAL: EK MARDE AFAQI

By: Raj Mohan Gandhi

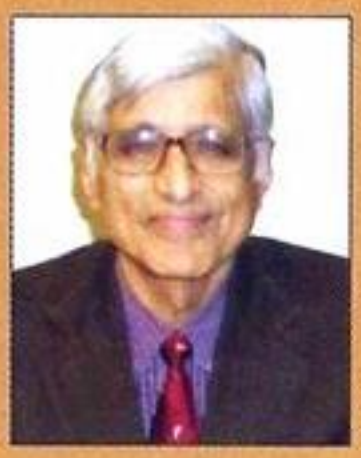

راج موہن گاندھی (پ:۱۹۲۵ء، نئی دہلی) بابائے قوم مہاتما گاندھی کے پوتے اور آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل راج گوپال چاری کے نواسے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صحافی اور ادیب سے زیادہ سیاسی جہدکار کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ راجیہ سبھا کے رکن ہونے کے علاوہ وی پی سنگھ وزارت میں اطلاعات اور نشریات کے وزیر بھی رہ چکے ہیں، راج موہن گاندھی، سنٹر فار پالیسی ریسرچ (دہلی) میں پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔

ان کے پسندیدہ موضوعات میں ہندو۔ مسلم تعلقات، ہند۔ پاک رشتے جنگ آزادی کی تاریخ، انسانی حقوق وغیرہ شامل ہیں۔ امریکہ، کنیڈا اور جاپان کی کئی جامعات میں وہ مہمان فیکلٹی کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

زیرنظر کتاب ان کی مشہور انگریزی تصنیف ''مسلم ذہن کا مطالعہ'' (۱۹۸۶ء) میں شامل علامہ اقبالؔ پر لکھے گئے طویل مضمون کا ترجمہ ہے۔

Translated by : Yousuf Kamal

یوسف کمال (پ:۱۹۴۰ء، حیدرآباد) عثمانیہ یونیورسٹی کے ارضیاتی سائنس کے موظف پروفیسر ہیں۔ سائنس کے علاوہ یوسف کمال کی دلچسپیوں میں اردو ادب، شاعری، میڈیا اور ترجمہ نگاری شامل ہیں۔ ترجموں کے علاوہ ان کے کئی سو طبعزاد مضامین، اردو اور انگریزی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''زمین کی کہانی'' کی تصنیف کے علاوہ شیو کے کمار کی انگریزی شاعری کا ترجمہ ''آسمان میں کمین گاہیں'' شائع ہو چکی ہیں۔ اردو فکشن کے علاوہ انہوں نے شیو کے کمار کے ساتھ فیضؔ کی شاعری کا بھی انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ زیرنظر کتاب ان کی ترجمہ نگاری کی کاوش کا نتیجہ ہے۔